زندگی کے عام فقہی مسائل

جلد اول

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

ترتیب

	پیش لفظ	۷
۱-	اذان کی تاریخ	۹
۲-	نماز میں سر ڈھانپنے کا مسئلہ	۱۰
۳-	جہری نماز تنہا پڑھنے کی صورت میں بہ آواز بلند قرأت	۱۳
۴-	فجر کی سنتیں	۱۳
۵-	معذوری میں جمع بین الصلوٰتین	۱۷
۶-	اگر دورانِ نماز موبائل کی گھنٹی بجنے لگے	۱۸
۷-	قضائے عمری اور فرضیتِ نماز کی عمر	۲۰
۸-	عورتوں کی نماز	۲۳
۹-	ناپاکی میں قرآن پڑھنا یا سننا	۲۷
۱۰-	اسقاط حمل کے بعد ناپاکی کی مدت	۲۸
۱۱-	نماز بیٹھ کر پڑھنا	۲۸
۱۲-	نماز تہجد کی باجماعت ادائی	۲۹
۱۳-	نماز وتر کی رکعتیں	۳۰
۱۴-	بعض نمازوں کا مخصوص طریقہ	۳۰
۱۵-	صلوٰۃ التسبیح کی شرعی حیثیت	۳۱
۱۶-	مردے کے لیے دعائے مغفرت اور ایصال ثواب	۴۰

۱۷- کرنسی نوٹ میں زکوٰۃ کا نصاب	۴۱
۱۸- سید خاندان کے لیے حرمتِ زکوٰۃ کی حکمت	۴۱
۱۹- زیورات پر زکوٰۃ	۴۲
۲۰- چاند دیکھ کر افطار کرنا	۴۶
۲۱- شوہر کے ساتھ حج	۴۷
۲۲- کیا آبِ زم زم کھڑے ہو کر پینا مسنون ہے؟	۴۸
۲۳- شادی کی رسمیں	۵۱
۲۴- دلہن کے لیے پالکی کا استعمال	۵۴
۲۵- بدلے کی شادی	۵۵
۲۶- عورت کا حقِ مہر	۵۸
۲۷- بیوی کا حقِ سکنیٰ	۶۳
۲۸- بیوی کی کمائی میں شوہر کا حق	۶۴
۲۹- نکاح میں دھوکہ	۶۵
۳۰- زوجین کے درمیان بے اعتمادی اور ناموافقت کا حل	۶۸
۳۱- طلاق کے بعد حلالہ کا حکم	۷۲
۳۲- دورانِ عدت عورت کا لباس	۷۸
۳۳- مسئلۂ ظہار	۸۱
۳۴- حجاب اور برقعہ	۸۲
۳۵- ملازمت پیشہ خواتین کا پردہ	۸۶
۳۶- پردہ- آزاد خیالی اور رواج پرستی کے درمیان	۸۷
۳۷- خواتین اور زیارتِ قبور	۸۹
۳۸- اولاد کے درمیان مال و جائیداد کی منصفانہ تقسیم	۹۲
۳۹- رشتے داروں کے ساتھ حسن سلوک	۹۶
۴۰- داڑھی کی اہمیت اور اس کی مقدار کا مسئلہ	۹۷

۴۱- نذر کی شرعی حیثیت ۱۰۰
۴۲- قسم کا کفّارہ ۱۰۴
۴۳- تعویذ گنڈوں کی شرعی حیثیت ۱۰۵
۴۴- گناہ اور توبہ ۱۰۶
۴۵- وسوسوں کا علاج ۱۰۹
۴۶- گھر سے نکلنے کے آداب ۱۱۲
۴۷- غیر مسلموں کی تقریبات میں چندہ دینا ۱۱۶
۴۸- کمیشن پر چندہ ۱۱۶
۴۹- دینی اجتماعات کی فوٹو گرافی ۱۱۶
۵۰- دینی اجتماعات میں خواتین کے لیے پروجیکٹر کا استعمال ۱۲۰

چند علمی استفسارات

۵۱- انبیاء اور ان کی امتوں سے میثاق الٰہی ۱۲۲
۵۲- سنتِ نبویؐ کا مقام ۱۲۳
۵۳- حجر اسود کی تاریخی اور شرعی حیثیت ۱۲۵
۵۴- ام المومنین حضرت عائشہؓ کا کم سنی میں نکاح ۱۲۷
۵۵- کیا آں حضرت ﷺ نے بعض خواتین کو طلاق دی ہے؟ ۱۳۰
۵۶- کیا روزِ قیامت تمام لوگ ہلاک ہو جائیں گے؟ ۱۳۲
۵۷- بعض مقاماتِ قرآنی کی تحقیق ۱۳۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

'زندگی کے عام فقہی مسائل' کوئی تصنیف نہیں بلکہ یہ ان سوالات و جوابات پر مشتمل ہے، جو فقہی استفسارات کے مستقل کالم کے تحت ماہ نامہ زندگی نو، نئی دہلی میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

مولانا سید احمد عروج قادری رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۹۸۶) کے زمانۂ ادارت (۱۹۶۰-۱۹۸۶) میں 'رسائل و مسائل' ماہ نامہ زندگی کا ایک مستقل اور مقبول کالم تھا۔ اس کے تحت وہ قارئین کے عموماً فقہی سوالات کے جوابات دیا کرتے تھے۔ فقہ پر مولانا مرحوم کی گہری نظر تھی۔ انھوں نے قرآن، حدیث اور مراجعِ فقہ کی روشنی میں پیش کردہ مسائل کے بڑے مدلّل اور تسلّی بخش جوابات دیے ہیں۔ ان کا مجموعہ، جسے راقمِ سطور نے 'احکام و مسائل' کے نام سے مرتّب کیا ہے، دو جلدوں میں مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کی وفات کے بعد 'زندگی نو' کی ادارت مشہور عالمِ دین، ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی کے موجودہ صدر اور جماعت اسلامی ہند کے امیر مولانا سید جلال الدین عمری مدّ ظلّہ کو تفویض ہوئی۔ اگرچہ فقہ اسلامی مولانا عمری کی بھی دلچسپی کا موضوع تھا، مگر موصوف کی متنوّع تحریکی و علمی مصروفیات کی بنا پر زندگی نو میں اس کالم کا تسلسل قائم نہ رہ سکا۔ ۱۹۹۱ سے اسلامی معاشیات کے معروف دانش ور ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی اس کے مدیر مقرر ہوئے، جب بھی یہ کالم بحال نہ ہو سکا۔ البتہ قارئین کی مسلسل یاد دہانی پر ان کی توجہ راقمِ سطور کی جانب ہوئی اور انھوں نے قارئینِ زندگی نو کی جانب سے آنے والے سوالات میرے پاس جواب کے لیے بھیجنے شروع کیے۔ میں نے تعمیلِ حکم کو اپنا فریضہ جانا اور اپنی صلاحیت و

استعداد کی حد تک عام فہم انداز میں ان کے مدلّل جوابات دیے۔ زیرِ نظر کتاب اب تک کے انھی سوالات وجوابات کا مجموعہ ہے۔

اس مجموعے کی اگر کچھ خصوصیت ہے تو یہ کہ اس میں فتوے کی مروّج زبان اور انداز سے گریز کیا گیا ہے۔ اس میں شامل جوابات کی حیثیت فتوے کی نہیں ہے۔ ان میں جو مسائل دریافت کیے گئے ہیں، وہ آئے دن پیش آتے رہتے ہیں یا کم از کم ذہنوں میں ابھرتے رہتے ہیں۔ جوابات قرآن کریم، احادیثِ نبوی اور تعاملِ صحابہ کی روشنی میں دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ بہ وقتِ ضرورت کتبِ فقہ سے بھی رجوع کیا گیا ہے۔ اختلافی مسائل کے جوابات میں کوشش کی گئی ہے کہ تمام مسالکِ فقہ بیان کر دیے جائیں اور جن نقلی وعقلی دلائل پر وہ مبنی ہیں انھیں بھی ذکر کر دیا جائے۔ مقامِ شکر ہے کہ قارئین کی بڑی تعداد نے ان جوابات پر اپنی پسندیدگی اور اطمینان کا اظہار کیا ہے۔

اہلِ علم اور خاص طور پر اصحابِ افتا اور ماہرینِ فقہ سے عاجزانہ گزارش ہے کہ اگر ان جوابات میں کوئی غلطی پائیں تو ازراہِ کرم ضرور مطّلع فرمائیں، شکریہ کے ساتھ انھیں درست کر دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کا فائدہ عام کرے اور اس کے اجر سے نوازے۔ انه نعم المولیٰ و نعم المجیب۔ آمین

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ — محمد رضی الاسلام ندوی

۳ر شعبان ۱۴۲۹ھ۔ ۵ر اگست ۲۰۰۸ء

اذان کی تاریخ

سوال: آج کل ہم اذان کے لیے، جن الفاظ کا استعمال کرتے ہیں ان کا انتخاب کیسے ہوا؟ یہ الفاظ معراج کے بعد منتخب ہوئے تھے یا معراج سے پہلے؟ کیا حضرت جبرئیل علیہ السلام نے مسجد اقصیٰ میں معراج کے موقعے پر یہی آج کی رائج اذان دی تھی، جب رسول عربی ﷺ نے انبیاء کی امامت فرمائی تھی؟

جواب: صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اذان کی مشروعیت ہجرت مدینہ کے بعد ہوئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں: ''مسلمان (ہجرت کے بعد) مدینہ پہنچے تو وہاں وہ نمازوں کے اوقات کا اندازہ لگا کر اکٹھا ہوتے تھے، اذان نہیں دی جاتی تھی۔ انھوں نے باہم مشورہ کیا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ نماز کا وقت ہونے پر ناقوس بجایا جائے، جس طرح نصاریٰ کرتے ہیں۔ کسی نے کہا: شنکھ بجایا جائے، جس طرح یہود کرتے ہیں۔ (صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب بدء الاذان، حدیث: ٦٠٤) کسی نے مشورہ دیا کہ نماز کے وقت جھنڈا بلند کیا جائے، اسے دیکھ کر لوگوں کو علم ہو جائے گا۔ (سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب بدء الاذان، حدیث: ٤٩٨) آں حضرت ﷺ کو کوئی مشورہ پسند نہیں آیا۔ (سنن ابی داؤد، حوالہ سابق، سنن ابن ماجہ، ابواب الاذان، باب بدء الاذان، حدیث: ٧٠٦) صحابہ اسی غور و فکر میں تھے کہ حضرت عبداللہ بن زیدؓ نے خواب میں پوری اذان سنی۔ خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہو کر انھوں نے اپنا خواب بیان کیا۔ آں حضرت ﷺ نے حکم دیا کہ وہ حضرت بلالؓ کو اذان سکھا دیں اور حضرت بلالؓ اذان دیں (کیوں کہ حضرت بلالؓ کی آواز بلند تھی)۔ حضرت عمر بن الخطابؓ نے آ کر اطلاع دی کہ اذان کے یہی کلمات انھیں بھی خواب میں

سکھائے گئے ہیں۔آں حضرت ﷺ نے ان خوابوں کی تصدیق کی اور انھیں 'سچا خواب' قرار دیا۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اذان کی مشروعیت ہجرت سے قبل مکہ ہی میں ہوگئی تھی۔سفر معراج میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کو اذان سکھا دی گئی تھی۔حضرت جبرئیلؑ نے اذان دی تھی اور آں حضرت ﷺ نے امامت کی تھی۔لیکن حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

والحق انه لا يصح شيء من هذه الأحاديث (ان احادیث میں سے کوئی صحیح نہیں ہے)۔فتح الباری ۲/۷۹

علامہ ابن منذرؒ نے قطعیت سے کہا ہے کہ مکہ میں نماز کی فرضیت کے وقت سے مدینہ ہجرت کرنے اور وہاں اذان کے بارے میں مشورہ کرنے تک آں حضرت ﷺ بغیر اذان کے نماز ادا کرتے تھے۔ (فتح الباری، حوالہ سابق)

نماز میں سر ڈھانپنے کا مسئلہ

سوال: میں نماز کے لیے کبھی ٹوپی لگاتا ہوں اور کبھی نہیں لگاتا۔اس لیے کہ میرے علم کے مطابق ٹوپی نماز کے شرائط میں داخل نہیں ہے،لیکن یہاں ہمارے امام صاحب کا کہنا ہے کہ لوگ بغیر ٹوپی کے نماز پڑھنے پر اعتراض کرتے ہیں۔اب مجھے الجھن یہ ہے کہ اگر میں ٹوپی لگاتا ہوں تو دل میں خیال ہوتا ہے کہ میں امام صاحب کو یا دوسرے لوگوں کو خوش کرنے کے لیے یہ عمل کر رہا ہوں اور جو عمل لوگوں کو یا کسی انسان کو خوش کرنے کے لیے کیا جائے اس سے شرک میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔اکثر مسلمان داڑھی کے بغیر نماز پڑھتے ہیں۔پاجامے ٹخنوں سے نیچے لٹک رہے ہوتے ہیں، جو گندگی سے بھرے ہوتے ہیں۔کوئی اعتراض نہیں کرتا، جب کہ ان دونوں کے بارے میں صحیح حدیثوں میں وضاحت آئی ہے۔لیکن ٹوپی کے بارے میں کوئی واضح حکم موجود نہیں ہے۔لیکن اس پر بہت زور دیا جاتا ہے۔کیا امام صاحب کی یہ ذمے داری نہیں کہ وہ لوگوں کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کریں کہ کس چیز کا دین میں کیا مقام ہے؟ برائے مہربانی رہ نمائی فرمائیں۔

جواب: نماز میں سر ڈھانپنے کے مسئلے پر ہمارے سماج میں افراط وتفریط پائی جاتی ہے۔ایک طرف

اس کو اس حد تک ضروری سمجھ لیا گیا ہے کہ اس کے بغیر نماز کو درست ہی نہیں خیال کیا جاتا۔ مسجدوں میں پہلے کھجور اور تاڑ کے پتوں کی بنی ہوئی ٹوپیاں رکھی جاتی تھیں۔ اب ان کی جگہ پلاسٹک کی ٹوپیوں نے لے لی ہے۔ کثرتِ استعمال سے وہ ٹوٹ جاتی ہیں، گندی ہوجاتی ہیں اور ان میں بدبو آنے لگتی ہے، مگر ننگے سر آنے والے نمازی مسجد میں داخل ہوتے ہی انھیں ادھر ادھر تلاش کرتے ہیں اور جیسی بھی ٹوپی ہاتھ لگے اسے اپنے سر کی زینت بنا کر نماز میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ دوسری جانب تفریط کا عالم یہ ہے کہ بعض حضرات نماز میں ننگے سر رہنے کا اس حد تک اہتمام کرتے ہیں، لگتا ہے کہ ان کے نزدیک سر ڈھانپ کر نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ بعض حضرات کے ایسے غلو آمیز رویے کی بھی اطلاع ملی ہے کہ وہ ٹوپی لگائے ہوتے ہیں۔ لیکن مسجد میں داخل ہوتے ہیں تو ٹوپی اتار کر جیب میں رکھ لیتے ہیں اور ننگے سر نماز پڑھتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ٹوپی نماز کے شرائط میں داخل نہیں ہے۔ اس کے بغیر بھی نماز بلا کراہت جائز ہے۔ لیکن احادیث و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کا معمول سر ڈھانپ کر نماز پڑھنے کا تھا۔ آں حضرت ﷺ کے لباس کے معمولات میں تھا کہ آپ ﷺ کبھی صرف ٹوپی (بغیر عمامہ کے) کبھی صرف عمامہ (بغیر ٹوپی کے) اور کبھی ٹوپی اور عمامہ دونوں پہنتے تھے۔ (زاد المعاد، ابن قیم، ۱/۱۳۵، فصل فی ملابسہ)

کتب احادیث میں آں حضرت ﷺ کے طریقۂ وضو میں مروی ہے کہ آپ عمامہ پر مسح فرماتے تھے۔ ظاہر ہے کہ عمامہ کے ساتھ ہی آپ نماز بھی ادا فرماتے ہوں گے۔ حضرت حسنؒ فرماتے ہیں کہ صحابۂ کرام نماز میں عمامہ اور ٹوپی پہنے ہوتے تھے۔ (صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب السجود علی الثوب فی شدّۃ الحرّ، حدیث: ۳۸۵ و ترجمۃ الباب) اس کے بالمقابل آں حضرت ﷺ کے ننگے سر نماز پڑھنے کے سلسلے میں کوئی روایت نہیں ملتی۔ اس لیے ننگے سر نماز پڑھنے کے مقابلے میں سر ڈھانپ کر نماز پڑھنا میرے نزدیک پسندیدہ ہے۔

یہ بات کہ چوں کہ ننگے سر نماز پڑھنے پر لوگ اعتراض کرتے ہیں، اس لیے کہ ان کے اعتراض سے بچنے اور انھیں خوش کرنے کے لیے ٹوپی پہن کر نماز پڑھنے سے 'شرک' میں مبتلا

ہونے کا اندیشہ ہے، صحیح نہیں ہے۔ حکمتِ دعوت یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھنے کے بہ جائے بڑے مقصد پر نظر رکھی جائے۔ اگر ننگے سر نماز پڑھنے پر اصرار کے نتیجے میں عوام کے ہم سے دور ہو جانے اور متنفر ہو جانے کا اندیشہ ہو تو حکمت دعوت یہ ہے کہ ٹوپی لگا کر نماز پڑھی جائے۔ یوں بھی ٹوپی لگا کر نماز پڑھنے سے نماز میں کوئی کراہت نہیں آتی۔ بلکہ اگر نبی اکرم ﷺ کی اتباع کی نیت کر لی جائے تو ثواب ہی ملے گا۔ آں حضرت ﷺ کے ایک عمل سے اس حکمت کی جانب واضح اشارہ ملتا ہے۔

عہد جاہلیت میں ایک موقعے پر خانۂ کعبہ کی از سرِ نو تعمیر کی ضرورت پیش آئی تو قریش نے ٹھیک ان بنیادوں پر اس کی تعمیر نہیں کی، جن پر حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کی تھی، بلکہ کچھ حصہ چھوڑ دیا تھا۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ایک موقعے پر آں حضرت ﷺ نے انھیں مخاطب کر کے فرمایا:

لَوْلاَ حَدَاثَةُ عَهْدِ قَوْمِکَ بِالْكُفْرِ لَنَقَضْتُ الْكَعْبَةَ وَ لَجَعَلْتُهَا عَلٰى أَسَاسِ اِبْرَاهِيْمَ.

(صحيح مسلم، كتاب الحج، باب نقض الكعبة وبنائها، حديث: ١٣٣٣، صحيح بخاری، كتاب الحج، باب فضل مكة و بنيانها حديث: ١٥٨٥، ١٥٨٦)

''تمھاری قوم کا کفر و جاہلیت کا زمانہ ابھی قریب کا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو میں کعبہ کو ڈھا کر اسے از سرِ نو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیاد پر تعمیر کرتا۔''

صحیح بخاری میں اس موقعے پر آپ ﷺ کا یہ ارشاد بھی ہے:

فَأَخَافُ اَنْ تُنْكِرَ عُقُوْلُهُمْ. (كتاب الحج، باب فضل مكة و بنيانها، حديث: ١٥٨٤)

''مجھے اندیشہ ہے کہ میرا یہ عمل ان کی عقلوں کو ناگوار ہوگا۔''

امام بخاریؒ نے اس مضمون کی ایک حدیث پر بڑا بصیرت افروز ترجمۃ الباب قائم کیا ہے:

باب من ترک بعض الاختيار مخافة ان يقصر فهم بعض الناس عنه فيقعوا فی أشدّ منه. (كتاب العلم، باب:٤٨)

''بعض اختیاری چیزوں کو اس وجہ سے چھوڑ دینا (جائز ہے) کہ بعض لوگ اس کی حقیقت نہیں سمجھ پائیں گے، چناں چہ وہ اس سے زیادہ مشکل میں پڑ جائیں گے۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی عمل کے صحیح ہونے کے باوجود اگر اس کی وجہ سے لوگوں کے فتنے میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو اسے ترک کر دینا اولیٰ ہے۔

دین میں ہر عمل کا اپنا ایک مقام ہے۔ اس کو اسی مقام پر رکھنا چاہیے۔ نفل، مباح اور مندوب کو فرض و واجب بنا دینا اور فرائض سے سراسر غفلت برتنا بے اعتدالی کا مظہر ہے۔ علمائے دین اور خاص طور سے ائمہ مساجد کی ذمے داری ہے کہ عوام کو اس جانب برابر متوجہ کرتے رہیں اور ان کی ذہنی و فکری تربیت کرتے رہیں۔ اعتدال اسلامی شریعت کا امتیاز ہے اور اللہ کے رسول ﷺ نے افراط و تفریط سے بچنے کی تلقین فرمائی ہے۔

جہری نماز تنہا پڑھنے کی صورت میں بہ آواز بلند قرأت

سوال: کوئی شخص کسی جگہ اکیلا ہے، جماعت سے نماز پڑھنے کے لیے کوئی دوسرا شخص وہاں نہیں ہے تو کیا اس صورت میں وہ شخص فجر، مغرب اور عشاء کی نمازوں میں اونچی تیز آواز سے قرأت کر سکتا ہے؟

جواب: منفرد جہری نمازوں میں آواز سے قرأت کر سکتا ہے۔ اس جیسے ایک سوال کا جواب مولانا عزیز الرحمٰن عثمانیؒ سابق مفتی اول دار العلوم دیوبند نے یہ دیا ہے ''جہری نمازوں میں (تنہا شخص کے لیے) قراۃ بالجہر پڑھنا اچھا ہے اور جہر بالتکبیر بھی درست ہے۔ مگر زیادہ جہر نہ کرے۔ کسی قدر جہر میں کچھ حرج نہیں ہے۔'' (فتاویٰ دار العلوم دیوبند، ۲/ ۲۴۸)

فجر کی سنتیں

سوال: لوگ فجر کی نماز میں جماعت ہوتے ہوئے وہیں سنتیں پڑھتے رہتے ہیں، جب کہ فرائض پر سنتوں کو ترجیح دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ براہ کرم اس کے بارے میں وضاحت فرمائیں۔

جواب: احادیث میں فجر کی سنتوں کی بہت تاکید آئی ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

''نبی ﷺ نوافل میں سب سے زیادہ اہتمام فجر کی سنتوں کا فرماتے تھے۔''

(صحیح بخاری، ابواب التهجد، حدیث:٦١٩، صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرین، باب استحباب رکعتی سنة الفجر، حدیث:٧٢٤)

ام المومنین ہی کی دوسری روایت ہے:

''نبی ﷺ سفر میں ہوں یا حضر میں، فجر کی سنتوں کو کبھی نہیں چھوڑتے تھے۔''

(صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلاة، حدیث:٥٩٢، صحیح مسلم، کتاب صلاۃالمسافرین، حدیث:٨٣٥)

اسی اہمیت کی بنا پر بعض علماء نے لکھا ہے کہ اگر مسجد میں فجر کی جماعت کھڑی ہوگئی ہو اور ایک رکعت ملنے کی امید ہو تو جماعت میں شامل ہونے سے پہلے سنتیں پڑھ لینی چاہئیں۔ بلکہ بعض علماء یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر فرض کی دونوں رکعتیں چھوٹ جانے کا اندیشہ ہو اور آدمی صرف قعدۂ اخیرہ میں شامل ہو سکتا ہو تو بھی پہلے سنتیں پڑھ لے پھر جماعت میں شامل ہو۔ یہ بات روحِ شریعت اور احادیثِ نبوی کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ فجر کی سنتوں کی کتنی ہی اہمیت کیوں نہ ہو، مگر وہ فرض سے بڑھ کر نہیں ہو سکتیں۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت کھڑی ہو جانے کے بعد سنتیں پڑھنا ممنوع ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

اِذَا اُقِيْمَتِ الصَّلاَ ةُ فَلاَ صَلاَ ةَ اِلَّا الْمَكْتُوْبَةُ. (صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرین، باب کراهة الشروع فی نافلة بعد شروع المؤذن، حدیث:٧١٠)

''جب جماعت کھڑی ہو جائے تو فرض کے علاوہ کوئی نماز نہ پڑھی جائے۔''

ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ فجر کی نماز پڑھا رہے تھے۔ ایک شخص مسجد میں آیا۔ پہلے اس نے ایک کنارے دو رکعتیں پڑھیں، پھر جماعت میں شامل ہوا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا:

يَافُلاَنُ! بِاَيِّ الصَّلاَ تَيْنِ اِعْتَدَدْتَ؟ اَبِصَلاَتِكَ وَحْدَكَ، اَمْ بِصَلاَتِكَ مَعَنَا. (صحیح مسلم، حوالہ سابق، حدیث:۷۱۲)

''اے فلاں! تمھاری (فجر کی) نماز کون سی ہوئی؟ جو تم نے تنہا پڑھی ہے وہ یا، جو ہمارے ساتھ پڑھی ہے؟''

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے نماز فجر کے موقعے پر دیکھا کہ جماعت کھڑی ہوگئی ہے۔ مؤذن اقامت کہہ رہا ہے اور ایک شخص الگ ہٹ کر سنتیں پڑھ رہا ہے۔ آں حضرت ﷺ نے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

اَلصُّبْحُ اَرْبَعًا، اَلصُّبْحُ اَرْبَعًا. (صحیح بخاری، کتاب الاذان ، باب اذا اقیمت الصلاۃ فلا صلاۃ الا المکتوبۃ، حدیث: ٦٦٣، صحیح مسلم، باب کراھۃ الشروع فی نافلۃ بعد شروع المؤذن، حدیث: ٧١١)

''کیا فجر کی چار رکعتیں پڑھی جائیں گی، کیا فجر کی چار رکعتیں پڑھی جائیں گی؟''

حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمٰنؒ فرماتے ہیں:

''کچھ لوگوں نے اقامت سنی، پھر بھی جماعت میں شامل نہیں ہوئے اور الگ سنتیں پڑھتے رہے۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو انھیں دیکھ کر خفگی سے دو مرتبہ فرمایا:

اَصَلاَ تَانِ مَعًا. (موطا امام مالك، کتاب صلاۃ اللیل، باب ماجاء فی رکعتی الفجر، حدیث: ٥٦٣ یہ حدیث مرسل ہے)

''کیا دو نمازیں ایک ساتھ ہوں گی؟''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص فجر کی نماز کے لیے مسجد اس وقت پہنچے جب جماعت کھڑی ہوگئی ہو تو اس وقت اسے سنتیں نہیں پڑھنی چاہئیں، بلکہ جماعت میں شامل ہو جانا چاہیے۔

اگر کسی کی فجر کی سنتیں چھوٹ جائیں تو وہ انھیں کب پڑھے؟ احناف کے نزدیک ان کی قضا سورج نکلنے کے بعد کی جائے گی، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے، جن اوقات میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے ان میں سے ایک فجر کی فرض نماز کے بعد سے طلوع آفتاب تک کا وقت ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

لاَ صَلاَةَ بَعْدَ الصُّبْحِ حَتّٰی تَرْتَفِعَ الشَّمْسُ، وَ فِیْ رِوَایَةٍ حَتّٰی تَطْلُعَ الشَّمْسُ. (صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلاۃ، باب لا یتحرّی الصلاۃ قبل غروب الشمس، حدیث: ۵۸۶، صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب الاوقات التی نھی عن الصلاۃ فیھا، حدیث:۸۲۵)

''فجر کی نماز کے بعد کوئی نماز نہیں، یہاں تک کہ سورج طلوع ہو جائے۔''

دوسری حدیث میں ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

مَنْ لَّمْ یُصَلِّ رَکْعَتَیِ الْفَجْرِ فَلْیُصَلِّھَا بَعْدَ مَا تَطْلُعُ الشَّمْسُ. (جامع ترمذی، کتاب الصلاۃ، باب ماجاء فی اعادتھما بعد طلوع الشمس، حدیث ۴۲۳، صحّحہ الألبانی)

''جو شخص فجر کی دو رکعتیں سنت نہ پڑھ سکا ہو وہ انھیں سورج نکلنے کے بعد پڑھے۔''

البتہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں طلوعِ آفتاب سے قبل بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ حضرت قیس بن عمروؓ فرماتے ہیں:

''میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جماعت سے فجر کی نماز پڑھی، پھر (اپنی چھوٹی ہوئی) سنتیں پڑھنے لگا۔ آپؐ نے فرمایا: مَھْلاً یَا قَیْسُ اَصَلاَتَانِ مَعًا؟ اے قیس، ٹھہرو۔ کیا دو نمازیں ایک ساتھ پڑھو گے؟ دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: صَلاَۃُ الصُّبْحِ رَکْعَتَانِ فجر کی تو صرف دو رکعتیں ہیں (پھر یہ مزید کیوں پڑھنے لگے؟) میں نے عرض کیا: میں فجر کی سنتیں نہیں پڑھ سکا تھا۔ انھیں اب ادا کر رہا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: فَلاَ اِذًا (تب کوئی بات نہیں)۔ دوسری روایت میں ہے کہ یہ سن کر آپؐ نے سکوت فرمایا۔'' (سنن ابی داؤد، کتاب التطوع، باب من فاتتہ متی یقضیھا، حدیث:۱۲۶۷، جامع الترمذی، کتاب الصلاۃ، باب ماجاء فیمن تفوتہ الرکعتان قبل الفجر یصلیھما بعد صلاۃ الفجر، حدیث:۴۲۲، صحّحھا الالبانی)

اس تفصیل سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے کہ فجر کی سنتیں نہ چھوٹنے پائیں۔

(۲) جماعت کھڑی ہوگئی ہو تو جماعت میں شامل ہو جانا چاہیے، اس وقت سنتیں نہیں پڑھنی چاہئیں۔

(۳) فجر کی سنتوں کی قضا طلوع آفتاب کے بعد کی جائے۔ البتہ اگر طلوعِ آفتاب کے بعد تک موخر کرنے کی صورت میں ان کے بالکل چھوٹ جانے کا اندیشہ ہو تو اس سے قبل بھی انھیں ادا کیا جاسکتا ہے۔

معذوری میں جمع بین الصلوٰتین

سوال: میں اٹھاسی (۸۸) سال کا بوڑھا ہوں۔ ویسے تو اچھا ہوں، لیکن دونوں گھٹنوں میں درد رہتا ہے، جس سے زمین پر بیٹھ نہیں پاتا ہوں۔ کرسی پر بیٹھ کر نماز ادا کرتا ہوں۔ افاقے کی صورت میں کھڑے ہو کر پڑھ لیتا ہوں۔ مرض کی تکلیف سے مغرب اور عشا کی نمازیں ایک ساتھ پڑھتا ہوں۔ مغرب بعد سورۂ یٰسین، سورۂ واقعہ اور سورۂ ملک پڑھنے کا معمول ہے۔ بہ راہِ کرم رہ نمائی فرمائیں۔ کیا میں مغرب کی نماز کے فوراً بعد عشاء کی نماز پڑھ لیا کروں، یا ان وظائف کے بعد پڑھا کروں؟

جواب: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ○ (النساء:۱۰۳)

''نماز درحقیقت ایسا فرض ہے، جو پابندیِ وقت کے ساتھ اہلِ ایمان پر لازم کیا گیا ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ہر نماز کو اس کا وقت شروع ہونے پر ہی ادا کیا جاسکتا ہے، وقت سے قبل نہیں۔ احادیث میں پانچوں نمازوں کے اوقات کی تحدید کردی گئی ہے۔ مغرب کا وقت سورج غروب ہونے کے بعد سے جانب مغرب شفق (سرخی) غائب ہونے تک ہے۔ یہ تقریباً سوا گھنٹے کا وقت ہوتا ہے۔ عشاء کا وقت شفق غائب ہونے کے بعد سے صبح صادق تک ہے۔

معذوری کی وجہ سے اگر مغرب اور عشاء کی نمازوں کو ایک ساتھ ادا کرنے میں

آسانی ہو تو عشاء کی نماز کو مغرب کی نماز کے ساتھ (مغرب کے وقت میں) ادا کرنے کے بہ جائے، نماز مغرب کی ادائی کو مؤخر کیا جائے اور اسے آخر وقت میں ادا کیا جائے۔ پھر زیر معمول اوراد و وظائف پڑھے جائیں۔ حتیٰ کہ عشاء کا وقت شروع ہو جائے تو عشاء کی نماز پڑھ لی جائے۔ اس طرح معذوری کی صورت میں مغرب اور عشاء کی نمازوں میں ظاہری جمع بین الصلوٰتین کیا جا سکتا ہے۔

اگر دورانِ نماز موبائل کی گھنٹی بجنے لگے

سوال: آج کل موبائل کا رواج بہت عام ہو گیا ہے اور ان میں طرح طرح کی رنگس ٹونس (Ring Tones) ہوتی ہیں۔ بارہا ایسی صورت حال دیکھنے کو ملتی ہے کہ دورانِ نماز باجماعت کسی مصلّی کا موبائل بجنے لگا اور کافی دیر تک بجتا رہا۔ اس سے اس نمازی کے ساتھ دیگر نمازیوں کی بھی توجہ بٹتی ہے اور ان کے خشوع و خضوع میں خلل پڑتا ہے۔ مسجدوں میں موبائل بند کرنے کی ہدایات آویزاں کی جاتی ہیں۔ مگر پھر بھی کوئی نہ کوئی نمازی اپنا موبائل بند کرنا بھول جاتا ہے۔ اگر کسی شخص کا موبائل بجنے لگے تو وہ کیا کرے؟ کیا اپنی نماز توڑ کر موبائل بند کرے، پھر نماز میں شامل ہو یا اپنی نماز جاری رکھے اور موبائل بجنے دے؟ یہ سوال پوچھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی، کیوں کہ دیکھا گیا ہے کہ بعض حضرات اپنی نماز میں مشغول رہتے ہیں اور ان کا موبائل بجتا رہتا ہے۔

جواب: مسجد عبادت کی جگہ ہے، وہاں ایسا ماحول قائم رکھنے کا اہتمام کرنا چاہیے کہ تمام لوگ پورے اطمینان، سکون، انہماک اور خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کر سکیں اور ان چیزوں سے بچنا چاہیے، جو نمازیوں کے خشوع و خضوع میں مخل ہوں اور ان کی توجہ بٹاتی ہوں۔ ایک مرتبہ ایک شخص کا اونٹ کھو گیا۔ اس نے مسجد میں اس کا اعلان کر دیا۔ آں حضرت ﷺ نے ایسا کرنے سے منع کیا اور فرمایا:

اِنَّمَا بُنِيَتِ الْمَسَاجِدُ لِمَا بُنِيَتْ لَهُ. (سنن ابن ماجه، كتاب المساجد، باب النهى عن انشاد السؤال فى المسجد، حديث:٧٦٥)

''مسجدیں تو مخصوص کام (عبادتِ الٰہی) کے لیے بنائی گئی ہیں۔''

موبائل کی گھنٹی سے یقینی طور پر مسجد میں موجود تمام افراد کے انہماک وخشوع میں خلل پڑتا ہے، اس لیے مسجد میں داخل ہوتے ہی فوراً موبائل بند یا وائبریشن پر کر دینا چاہیے۔

اگر کوئی شخص اپنا موبائل بند کرنا بھول جائے اور وہ دورانِ نماز بجنے لگے تو فوراً اسے بند کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر یا موبائل باہر نکال کر معمولی حرکت سے اسے بہ آسانی بند کیا جا سکتا ہے۔

بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ ارکانِ نماز کی ادائی میں اعضائے جسم کی، جو حرکت ہوتی ہے اس کے علاوہ معمولی سے معمولی حرکت سے بھی نماز خراب ہو جاتی ہے۔ حالاں کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

اِذَا صَلّٰی اَحَدُکُمْ اِلٰی شَیْءٍ یَسْتُرُہٗ مِنَ النَّاسِ، فَاَرَادَ اَحَدٌ اَنْ یَّجْتَازَ بَیْنَ یَدَیْہِ فَلْیَدْفَعْہُ فَاِنْ اَبٰی فَلْیُقَاتِلْہُ. (صحیح بخاری، کتاب الصلاۃ، باب یرد المصلی من مرّ بین یدیہ، حدیث: ۵۰۹، صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب سترۃ المصلّی، حدیث:۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰)

''کوئی شخص اپنے آگے سترہ رکھ کر نماز پڑھ رہا ہو، پھر کوئی دوسرا اس کے آگے سے پار ہونے کی کوشش کرے تو اس کو دھکا دے دے، اگر وہ پھر بھی نہ مانے تو اس کے ساتھ اور سختی کرے۔''

راویِ حدیث حضرت ابوسعید خدریؓ نے ایک مرتبہ خود اس حدیث پر اس طرح عمل کیا کہ ایک نوجوان نے ان کے سامنے سے گزرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے دھکا دیا۔ اس نوجوان نے دوبارہ نکلنا چاہا تو حضرت ابوسعیدؓ نے دوبارہ اور زور سے دھکا دیا۔ اس نوجوان نے حضرت ابوسعیدؓ کو برا بھلا کہا اور کودتا پھاندتا باہر نکل گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نوجوان حکم راں خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے خلیفۂ وقت مروان سے شکایت کی۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت ابوسعیدؓ بھی خلیفہ کے پاس پہنچ گئے۔ انھوں نے اس نوجوان کی شکایت کا تذکرہ حضرت ابوسعیدؓ سے کیا۔ انھوں نے اس موقعے پر درج بالا حدیث سنائی۔

(صحیح بخاری وصحیح مسلم، حوالہ سابق)

اس طرح کی اور بھی بہت سی حدیثیں ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دورانِ نماز وقتِ ضرورت کسی قدر حرکت سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ 'عملِ کثیر' (زیادہ عمل) سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔ 'عملِ قلیل' (معمولی عمل) سے باطل نہیں ہوتی۔ ان کے نزدیک عملِ کثیر سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص دورانِ نماز کوئی ایسا کام کرے، جس سے دیکھنے والا یہ سمجھ لے کہ وہ نماز نہیں پڑھ رہا ہے۔ (الموسوعة الفقهية، ۲۷/۱۲۶)

اگر کسی شخص کا موبائل معمولی عمل سے نہ بند ہوتا ہو تو اسے چاہیے کہ اپنی نماز توڑ کر موبائل بند کرے اور دوبارہ نماز میں شامل ہو۔ یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ اپنی نماز جاری رکھے اور اس کے موبائل کی میوزک پوری مسجد میں گونج رہی ہو۔

قضائے عمری اور فرضیتِ نماز کی عمر

سوال: میں نے اپنے اندازے سے طے کیا تھا کہ میری نمازیں دس سال تک قضا ہوئی ہیں۔ میں احتیاطاً گیارہ سال سے قضائے عمری کی نمازیں ادا کر رہا ہوں۔ کیا میں اب سمجھ لوں کہ میری چھوٹی ہوئی نمازیں ادا ہو گئیں؟ نیز یہ بھی بتلائیے کہ نماز کتنی عمر میں فرض ہوتی ہے؟

جواب: دین اسلام میں نماز کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کسی شخص کے دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کا عملی اظہار نماز کے ذریعے ہوتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے نماز کو ایمان اور کفر و شرک کے درمیان حدِ فاصل قرار دیا ہے۔ فرمایا:

اِنَّ بَيْنَ الرَّجُلِ وَ بَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ تَرْكَ الصَّلاَةِ.

(صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب بيان اطلاق اسم الكفر على من ترك الصلاة، حديث:۸۲)

''آدمی (کے ایمان) اور شرک و کفر کے درمیان نماز (پڑھنے) اور نہ پڑھنے کا فاصلہ ہے۔''

جس شخص کو نماز کی اس اہمیت کا احساس ہو اس کے نزدیک ایک نماز کا چھوٹ جانا اپنی عزیز ترین چیزوں، اہل و عیال اور مال و دولت سے محرومی کے برابر ہوگا۔ اس کی ترجمانی رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے:

اَلَّذِیْ تَفُوْتُهٗ صَلاَ ةُ الْعَصْرِ كَاَنَّمَا وُتِرَ اَهْلَهٗ وَ مَالَهٗ.

(صحیح بخاری، کتاب المواقیت، باب اثم من فاتته العصر، حدیث:۵۵۲، صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب التغلیظ فی تفویت العصر، حدیث :٦٢٦)

''جس شخص کی ایک عصر کی نماز چھوٹ جائے گویا وہ اپنے اہل وعیال اور مال ودولت سے محروم ہوگیا۔''

ایک غزوہ سے واپسی پر صحابۂ کرام نے رات کے آخری پہر پڑاؤ ڈالا۔ سب کی آنکھ لگ گئی یہاں تک کہ دن نکل آیا (اس شب کو لیلۃ التعریس کا نام دیا گیا ہے) صحابہ کو بڑی گھبراہٹ اور پشیمانی ہوئی اور اپنی کوتاہی کا احساس ہوا۔ اس موقعے پر نبی ﷺ نے فرمایا:

لاَ تَفْرِيْطَ فِى النَّوْمِ،اِنَّمَا التَّفْرِيْطُ فِى الْيَقَظَةِ.(سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب فیمن نام عن الصلاۃ او نسیها حدیث: ٤٣٧، مزید ملاحظہ کیجئے صحیح بخاری، حدیث: ٥٩٥، ٧٤٧١، صحیح مسلم، حدیث: ٦٨١)

''سوتے رہنے کی وجہ سے نماز چھوٹ جائے تو اس میں کوتاہی نہیں ہے۔ کوتاہی یہ ہے کہ آدمی بیداری کی حالت میں (جانتے بوجھتے) نماز چھوڑ دے۔''

اگر کسی شخص کی نماز سونے یا غفلت کی وجہ سے چھوٹ جائے تو اس کا حکم یہ ہے کہ بیدار ہونے پر یا متنبہ ہوتے ہی اسے ادا کرلے۔ آں حضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

اِذَا نَسِىَ اَحَدُكُمْ صَلاَ ةً اَوْ نَامَ عَنْهَا فَلْيُصَلِّهَا اِذَا ذَكَرَهَا.

(سنن الترمذی، کتاب الصلاۃ، باب ماجاء فی النوم عن الصلاۃ، حدیث:۱۷۷، سنن النسائی، کتاب المواقیت، باب فیمن نام عن صلاۃ، حدیث: ٦١٥)

''کوئی شخص نماز ادا کرنا بھول جائے یا سوتا رہ جائے تو جوں ہی اسے یاد آئے فوراً ادا کرلے۔''

کیا فرائض کے ساتھ سنن کی بھی قضا کی جائے گی؟ رسول اللہ ﷺ کے اسوہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر چھوٹی ہوئی نمازیں کم ہوں تو سنتوں کی قضا کرلینا بہتر ہے۔ لیکن اگر ان کی تعداد زیادہ ہو تو صرف فرض نمازوں کی قضا کرلینا کافی ہے۔ لیلۃ التعریس میں صحابۂ کرام کے ساتھ

آپؐ کی فجر کی نماز چھوٹ گئی تو آپؐ نے فرض اور سنت دونوں کی قضا کی اور غزوۂ خندق کے موقعے پر آپؐ کی چار نمازیں چھوٹ گئیں تو آپؐ نے صرف فرائض کی قضا کی۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ، ۲۲/۱۰۴)

اگر کوئی مسلمان جان بوجھ کر کچھ عرصے تک نماز نہ پڑھے، پھر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو تو وہ کیا کرے؟ کیا چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا لازم ہے یا اس کوتاہی کی تلافی محض توبہ سے ہو جائے گی؟ جمہور فقہاء کہتے ہیں کہ جب بھول کر سونے کی وجہ سے نماز چھوٹ جانے پر قضا واجب ہے تو جان بوجھ کر نماز چھوڑنے والے پر قضا کا وجوب بہ درجۂ اولیٰ ہوگا۔ وہ اس حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں، جس میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک شخص کو رمضان کا ایک روزہ توڑ دینے پر اس کی قضا کی ہدایت فرمائی تھی۔ (الموسوعة الفقهية، ٢٦/٣٤-٢٧) فقہاء یہ بھی کہتے ہیں کہ ترکِ نماز کا گناہ ختم ہونے کے لیے قضا اور توبہ دونوں ضروری ہیں۔ اس کے لیے ان میں سے کوئی ایک کفایت نہیں کرتا۔ (الفقه على المذاهب الاربعة، عبد الرحمن الجزيرى، ٤٩/١)

قضا کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنی چھوٹی ہوئی نمازوں کا اندازہ لگائے، پھر اپنی ہر فرض نماز کے بعد کچھ نمازیں قضا کی نیت سے ادا کر لیا کرے، یہاں تک کہ اس کو اپنی تمام چھوٹی ہوئی نمازوں کے ادا ہو جانے کا یقین یا ظنِ غالب ہو جائے۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ جان بوجھ کر چھوڑی گئی نمازوں کی قضا نہیں ہے، اس کوتاہی پر آدمی بارگاہِ الٰہی میں توبہ کرے اور ان کی تلافی کے لیے کثرت سے نوافل پڑھے۔ اس نقطۂ نظر کے حاملین میں داؤد ظاہریؒ، ابن حزمؒ اور ابن عبدالرحمٰن الشافعیؒ قابلِ ذکر ہیں۔

مولانا مودودیؒ نے ایک سوال کے جواب میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے۔ اس جواب پر ایک صاحب نے اپنے اشکالات رکھے تو مولانا نے انھیں یہ جواب دیا:

''پہلے میں خود بھی یہی خیال رکھتا تھا کہ جاہلیت کی حالت میں، جو نمازیں قصداً یا غفلت سے چھوڑی گئی ہیں ان کے لیے صرف توبہ کافی ہے اور ان کی قضا واجب نہیں۔ لیکن تحقیق کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اگر آدمی کافر نہ تھا، صرف جہالت اور غفلت کی بنا پر تارکِ نماز رہا، تو اس کے لیے صرف توبہ کافی نہیں، بلکہ پچھلی نمازوں کی قضا بھی کرنی چاہیے۔'' (رسائل ومسائل، ۳/۲۱۵-۲۱۶)

مولانا مودودیؒ نے آگے علامہ ابن تیمیہؒ کا حوالہ دیا ہے اور ان کی جانب بھی یہی بات

منسوب کی ہے، لیکن یہ نسبت صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ علامہ ابن تیمیہؒ نے اس معاملے میں فقہاء کے اختلاف کا تذکرہ کردیا ہے۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ، ۲۲/۱۸، ۱۰۳) بلکہ ان کی بعض تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا رجحان جان بوجھ کر چھوڑی گئی نمازوں کی قضا کے عدم وجوب کی طرف ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

فَإِنَّ الرَّجُلَ قَدْ يَعِيشُ مُدَّةً طَوِيلَةً لاَ يُصَلِّي وَلاَ يُزَكِّي وَ قَدْ لاَ يَصُومُ اَيْضًا..... وَغَيْرُ ذٰلِكَ، فَهُوَ فِي جَاهِلِيَّةٍ اِلَّا اَنَّهُ مُنْتَسِبٌ اِلَى الْاِسْلَامِ، فَاِذَا هَدَاهُ اللّٰهُ وَ تَابَ عَلَيْهِ، فَاِنْ اُوْجِبَ عَلَيْهِ قَضَاءَ جَمِيعِ مَا تَرَكَهُ مِنَ الْوَاجِبَاتِ..... صَارَتِ التَّوْبَةُ فِي حَقِّهٖ عَذَابًا. (فتاویٰ ابن تیمیہ، ۲۲/۲۱-۲۲)

''بسا اوقات آدمی طویل عرصے تک نماز، زکوٰۃ، روزہ وغیرہ سے بے پروا ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ بہ ظاہر مسلمان ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ جاہلیت کی زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔ اب اگر اللہ اسے ہدایت دے اور اسے توبہ کی توفیق ملے تو اگر اس پر تمام چھوٹی ہوئی واجبات کی قضا لازم کردی جائے تو توبہ اس کے حق میں عذاب بن جائے گی۔''

جہاں تک فرضیتِ نماز کی عمر کا سوال ہے۔ اس سلسلے میں جمہور فقہاء بلوغ کو حد قرار دیتے ہیں۔ البتہ اس سے قبل بھی بچوں کو نماز کی تلقین کی جائے گی اور نہ پڑھنے پر سختی کی جائے گی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے کہ بچہ سات سال کا ہوجائے تو اس سے نماز پڑھنے کو کہا جائے اور دس سال کا ہوجائے تو نماز نہ پڑھنے پر اس کی سرزنش کی جائے۔ (سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب متی یومر الغلام بالصلا ۃ، حدیث: ٤٩٤، سنن الترمذی، کتاب الصلاۃ، باب ما جاء متی یومر الصبی بالصلاۃ، حدیث: ٤٠٧) البتہ امام احمدؒ اس حدیث کی بنا پر فرضیت نماز کی عمر دس سال قرار دیتے ہیں۔ (المغنی، ابن قدامۃ، ١/٣٩٩، الموسوعۃ الفقھیۃ، ٣٤/٢٨-٢٩)

عورتوں کی نماز

سوال: الحمدللہ ہمارے گھر ہفتہ واری اجتماع ہوتا ہے، جس میں ہر مسلک کی بہنیں آتی ہیں، جو الحمدللہ بہت مخلص ہیں۔ نماز کے تعلق سے چند مسائل ایسے درپیش ہیں، جنھیں چند بہنیں، جو

اہلِ حدیث مسلک سے ہیں، ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ایک مسئلہ نماز میں عورت کے ستر کا ہے۔ آیا پیر، ستر میں ہے یا نہیں؟ ان بہنوں کا کہنا ہے کہ نماز میں پیر کا ڈھانپنا فرض ہے۔ دوسرا مسئلہ ہے مردوں اور عورتوں کی نماز میں فرق کا۔ جس میں خاص طور پر ہم عورتیں سجدہ سمٹ کر کرتی ہیں اور ہم اس کا جواز یہ بتاتے ہیں کہ پردہ کی مناسبت سے یہ زیادہ صحیح ہے۔لیکن ہم اس تعلق سے کسی حدیث کی وضاحت نہیں کر پاتے اور فقہ کی کتاب میں بھی اس تعلق سے حدیث نہیں ہے۔ جہاں تک میرا مطالعہ ہے ایک کیسٹ میں نے سنی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ عورتوں کے لیے سمٹ کر سجدہ کرنا افضل ہے۔ یہ کیسٹ شاہ بلیغ الدین صاحب کی تھی۔ ہماری یہ بہنیں بخاری کی اس حدیث کا حوالہ دیتی ہیں ''نماز اسی طرح پڑھو، جس طرح مجھے پڑھتے دیکھا ہے۔'' بہ راہ کرم اس سلسلے میں ہماری رہ نمائی فرمائیں۔

جواب: آپ اپنے گھر پر ہفتہ واری اجتماع منعقد کرتی ہیں، جس میں مختلف مسالک سے تعلق رکھنے والی بہنیں شریک ہوتی ہیں۔ اجتماع کے ذریعے آپ حضرات اپنی دینی معلومات میں اضافہ کرنے، دین کا فہم حاصل کرنے اور اللہ اور اس کے رسول کے احکام اور تعلیمات جاننے کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔ اس پر مبارک باد قبول فرمائیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: لَا يَقْعُدُ قَوْمٌ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ اِلَّا حَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ، وَ غَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ، وَ نَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ، وَ ذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيْمَنْ عِنْدَهٗ (صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء، باب فضل الاجتماع على تلاوة القرآن و على الذكر، حديث: ۲۷۰۰)

> ''جن مجلسوں میں اللہ کا ذکر ہوتا ہے، فرشتے ان کے شرکاء کو ڈھانپ لیتے ہیں، رحمتِ الٰہی ان پر سایہ فگن ہوتی ہے اور ان پر سکینت نازل ہوتی ہے اور اللہ عزّ وجل فرشتوں کے درمیان ان کا ذکر خیر کرتا ہے۔''

فقہی مسائل کے بارے میں ایک بنیادی بات یہ سمجھ لینی چاہیے کہ ائمہ فقہ نے شرعی دلائل (قرآن، سنت، اجتہاد، قیاس) کی روشنی میں مسائل کا استنباط کیا ہے۔ ان کے درمیان بعض مسائل میں، جو اختلاف ہے وہ حق و باطل کا نہیں بلکہ افضل اور غیر افضل کا اختلاف ہے۔ اس لیے جو لوگ قرآن وسنت سے بہ راہ راست استفادہ اور غیر منصوص میں اجتہاد پر قادر نہیں

ہیں ان کے لیے عافیت اسی میں ہے کہ ائمہ فقہ میں سے کسی امام پر اعتماد کریں اور اس کے بیانات پر عمل کریں۔ بعض مسائل میں اختلاف کو تنازعہ اور انتشار کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے۔ آپ کے دریافت طلب سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

(۱) سترِ عورت (جسم کے قابل ستر حصوں کو چھپانا) صحتِ نماز کی شرائط میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ خُذُوۡا زِیۡنَتَکُمۡ عِنۡدَ کُلِّ مَسۡجِدٍ (الاعراف:۳۱) ''اے بنی آدم! ہر عبادت کے موقعے پر اپنی زینت سے آراستہ رہو۔'' حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: اس آیت میں زینت سے مراد لباس ہے۔ (تفسیر طبری، ۱۲/۳۹۰)

نماز میں عورت کے لیے پورا بدن چھپانا ضروری ہے سوائے چند اعضاء کے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَا یُبۡدِیۡنَ زِیۡنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنۡهَا (النور:۳۱) ''اور اپنی زینت نہ دکھائیں بجز اس کے، جو خود ظاہر ہو جائے۔'' وہ اعضا کیا ہیں؟ ان کی تعیین میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک صرف چہرہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ امام مالکؒ و امام شافعیؒ کے نزدیک چہرہ اور ہتھیلیاں دونوں مستثنیٰ ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک چہرہ اور ہتھیلیوں کے ساتھ پیر بھی ستر میں شامل نہیں ہیں۔ (الافصاح عن معانی الصحاح، ابن هبیره، ۱/۱۱۸، الفقه علی المذاهب الاربعة، عبدالرحمن الجزیری، ۱/۱۸۸)

شوافع میں سے امام مزنیؒ اور حنابلہ میں سے علامہ ابن تیمیہؒ بھی پیروں کو ستر سے مستثنیٰ کرتے ہیں۔ (الموسوعة الفقهية، ۷/۸۵، ۲۷/۶۰، ۳۱/۴۴) علامہ ابن تیمیہؒ نے تفصیل سے اس موضوع پر بحث کی ہے۔ (ملاحظہ کیجیے، فتاویٰ ابن تیمیہ، ۲۲/۱۰۹-۱۲۰)

دیگر فقہاء میں سے امام اوزاعیؒ اور امام ابوثورؒ، امام مالکؒ و امام شافعیؒ کے ہم خیال ہیں اور امام ثوریؒ، امام ابوحنیفہؒ کے ہم خیال ہیں۔ (المجموع شرح المهذب للامام نووی، ۳/۱۷۵)

(۲) رسول اللہ ﷺ کے طریقۂ نماز کے سلسلے میں، جو روایات مروی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ سجدے میں اپنے بازوؤں کو پیٹ اور رانوں سے الگ رکھ کر سجدہ فرماتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن اقرمؓ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس طرح سجدہ

کرتے ہوئے دیکھا کہ آپؐ کے بغل کی سفیدی نظر آرہی تھی۔(جامع ترمذی، کتاب الصلاۃ، باب ماجاء فی التجافی فی السجود، حدیث:۲۷٤) حضرت میمونہؓ فرماتی ہیں: ''نبی ﷺ جب سجدہ کرتے تھے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اس حد تک الگ رکھتے تھے کہ بکری کا چھوٹا بچہ آپؐ کے نیچے سے نکل سکتا تھا۔'' (صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب ما یجمع صفۃ الصلاۃ... حدیث: ٤٩٦)

کیا سجدے کا یہ طریقہ مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے ہے یا عورتوں کے طریقۂ سجدہ میں کچھ فرق ہے؟

فقہاء کا خیال ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عمل سے، جو طریقہ معلوم ہو رہا ہے وہ مردوں کے لیے ہے۔عورتوں کے لیے بہتر ہے کہ وہ سمٹ کر اور اپنی رانوں کو پیٹ سے لگا کر سجدہ کریں۔ الموسوعۃ الفقھیۃ میں ہے ''عورت سجدے میں اپنے بازوؤں کو زمین پر بچھائے گی، اپنے پیٹ کو اپنی رانوں سے ملائے گی اور سمٹ کر سجدہ کرے گی۔ پردے کی مناسبت سے یہ اس کے لیے بہتر ہے۔ اس کے لیے مردوں کی طرح اپنے بازوؤں کو پیٹ سے الگ رکھنا مسنون نہیں ہے۔'' (۸۹/۷)

یہ فقہاء احناف ہی کا نہیں بلکہ شوافع اور حنابلہ کا بھی یہی خیال ہے۔فقہ شافعی کی مشہور کتاب 'المھذب' میں ہے: ''عورت سمٹ کر سجدہ کرے گی، اس لیے کہ یہ ستر کی مناسبت سے بہتر ہے۔'' اس کی شرح میں امام نوویؒ فرماتے ہیں: ''امام شافعیؒ اور ان کے اصحاب نے فرمایا ہے: ''مسنون یہ ہے کہ سجدے میں مرد اپنی کہنیوں کو اپنے پہلو سے دور رکھے اور اپنے پیٹ کو اپنی رانوں سے اٹھا کر رکھے اور عورت سمٹ کر سجدہ کرے۔'' (المجموع للنووی، ٤٠٥/٣)

حنبلی فقیہ امام خرقیؒ طریقۂ نماز کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ''اس سلسلے میں مرد اور عورت کا معاملہ یکساں ہے۔ سوائے اس کے کہ عورت رکوع اور سجدہ سمٹ کر کرے گی۔'' اس کی شرح میں علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ فرماتے ہیں: ''اصل یہ ہے کہ نماز کے جو احکام مردوں کے لیے ہیں، وہی عورتوں کے لیے بھی ہیں۔اس لیے کہ خطاب ان کو بھی شامل ہے سوائے ہیئت سجدہ کے۔ مردوں کے لیے سجدہ میں بازوؤں کو پہلو سے دور رکھنے کا حکم ہے لیکن عورتوں کے لیے مستحب ہے کہ وہ سمٹ کر سجدہ کریں، تاکہ ان کا ستر بہتر طریقے سے ہو سکے۔'' امام نوویؒ نے اس سلسلے میں حضرت علیؓ کا ایک اثر بھی نقل کیا ہے۔ (المغنی، ۶۲/۱ھ)

فقہاء نے عورتوں کے طریقۂ سجدہ میں فرق کے سلسلے میں ابوداؤدؒ، ابن ابی شیبہؒ اور بیہقیؒ کے حوالے سے بعض روایات نقل کی ہیں، لیکن ان کا پایۂ استناد کم زور ہے۔

ناپاکی میں قرآن پڑھنا یا سننا

سوال: کیا عورت ناپاکی کی حالت میں قرآن سن اور پڑھ سکتی ہے؟ کیا وہ اس حالت میں دستانے پہن کر قرآن چھو سکتی ہے؟

جواب: عورت کی ناپاکی کی تین حالتیں ہیں: جنابت، حیض (ماہ واری) اور نفاس (بعد از ولادت)۔ ان حالتوں میں قرآن سننے میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن قرآن پڑھنا جائز نہیں ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

لاَ تَقْرَأُ الْحَائِضُ وَلاَ الْجُنُبُ شَيْئًا مِّنَ الْقُرْآنِ. (جامع ترمذی، ابواب الطهارة، باب ماجاء فی الجنب والحائض انهما لا یقرآن القرآن، حدیث: ۱۳۱)

''حائضہ اور جنبی کچھ بھی قرآن نہ پڑھے۔''

ایک روایت میں ہے کہ نبی ﷺ حالتِ جنابت میں قرآن پڑھانے سے احتراز کرتے تھے۔ (جامع ترمذی، ابواب الطهارة، باب ماجاء فی الرجل یقرأ القرآن علی کل حال مالم یکن جنباً، حدیث: ۱٤٦)

حالتِ جنابت میں قرأت قرآن کے جائز نہ ہونے پر فقہاء کا اتفاق ہے۔ البتہ حیض و نفاس کی حالت میں مالکیہ قرأتِ قرآن جائز قرار دیتے ہیں۔ (الموسوعة الفقهية، ۳۳/۵۹، قراءة)

یہی حکم قرآن چھونے کا ہے۔ فقہاء نے ناپاکی کی حالت میں اسے ناجائز کہا ہے۔ ان کا استدلال آیتِ قرآنی اور حدیثِ نبوی دونوں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ (الواقعہ: ۷۹)

''اسے مطہرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔''

آں حضرت ﷺ نے اہلِ یمن کے لیے حضرت عمرو بن حزمؓ کے ساتھ، جو تحریر بھیجی تھی

اس میں یہ حکم بھی تھا کہ ''قرآن کو صرف پاک شخص ہی چھوئے۔'' (مستدرک حاکم، دارمی، دارقطنی)

البتہ فقہائے احناف نے معلّمۂ قرآن کے لیے کچھ رخصت دی ہے کہ وہ حالتِ حیض میں قرآن کا ایک ایک لفظ الگ الگ کر کے پڑھا سکتی ہے۔ (الموسوعۃ: ۱۸/۳۲۱)

اسقاطِ حمل کے بعد ناپاکی کی مدت

سوال: اگر حاملہ عورت کا ابتدائی دنوں میں بچہ گر جائے (Miscarriage) تو اس صورت میں وہ کتنے دنوں تک ناپاک رہتی ہے اور اس صورت میں نماز کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب: ولادت کے سبب آنے والے خون کو نفاس کہتے ہیں۔ خواہ ناقص الخلقت ولادت یا اسقاط ہو۔ اس کی کم سے کم کوئی حد نہیں، البتہ زیادہ سے زیادہ مدت چالیس دن ہے۔ حضرت ام سلمہؓ بیان کرتی ہیں: ''رسول اللہ ﷺ کے عہد میں عورت بعد از ولادت چالیس دن بیٹھی رہتی تھی۔'' (جامع ترمذی، ابواب الطهارة، باب ماجاء فی کم تمکث النفساء) امام ترمذیؒ نے یہ حدیث بیان کرنے کے بعد لکھا ہے: ''اہلِ علم (صحابہ، تابعین، تبع تابعین وغیرہ) کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بعد از ولادت عورت چالیس دن تک نماز نہیں پڑھے گی۔ الّا یہ کہ وہ اس سے پہلے ہی دیکھ لے کہ خون نہیں آرہا ہے تو وہ غسل کر کے نماز پڑھنا شروع کر دے۔ اور اگر وہ چالیس دن گزرنے کے بعد بھی خون دیکھے تو اکثر اہلِ علم کا کہنا ہے کہ وہ چالیس دن کے بعد نماز نہیں چھوڑے گی۔ یہ اکثر فقہاء کا قول ہے۔ سفیان ثوری، عبداللہ بن مبارک، شافعی، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ حسن بصریؒ کا قول ہے کہ اگر خون آنا بند نہ ہو تو وہ پچاس دنوں تک نماز نہیں پڑھے گی۔ عطا بن ابی رباحؒ اور شعبیؒ نفاس کی مدت ساٹھ دن قرار دیتے ہیں۔

(جامع ترمذی، حوالہ سابق)

احناف کے نزدیک بھی نفاس کی زیادہ سے زیادہ مدت چالیس روز ہے۔

نماز بیٹھ کر پڑھنا

سوال: بعض عورتیں فرض نماز بھی بیٹھ کر پڑھتی ہیں۔ نماز بیٹھ کر پڑھنے میں کوئی حرج تو نہیں۔ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے کیا زیادہ ثواب ملتا ہے؟

جواب: فرض نماز کھڑے ہوکر پڑھنی ضروری ہے۔ یہ حکم مرد اور عورت دونوں کے لیے ہے۔ اس لیے کہ قیام (کھڑا ہونا) نماز کے فرائض میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ (البقرہ:۲۳۸)

''اللہ کے آگے اس طرح کھڑے ہو، جیسے فرماں بردار غلام کھڑے ہوتے ہیں۔''

طاقت کے باوجود اگر کوئی شخص (خواہ مرد ہو یا عورت) فرض نماز بیٹھ کر پڑھے گا تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔ ہاں بیماری، کم زوری یا کوئی عذر ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ مجھے بواسیر کا مرض تھا۔ میں نے نبی ﷺ سے نماز کے متعلق دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا:

صَلِّ قَائِمًا، فَإِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَقَاعِدًا، فَإِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَعَلَى جَنْبٍ. (صحیح بخاری، ابواب تقصیر الصلاۃ، باب اذا لم یطق قاعداً صلی علی جنب، حدیث: ۱۱۱۷)

''کھڑے ہوکر نماز پڑھو، اگر کھڑے نہ ہوسکتے ہو تو بیٹھ کر پڑھو اور اگر بیٹھ نہ سکتے ہو تو لیٹ کر پہلو پر نماز پڑھو۔''

البتہ فرض کے علاوہ دوسری نمازوں میں طاقت کے باوجود بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے، البتہ اس کا ثواب کھڑے ہوکر نماز پڑھنے کی نسبت نصف ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

صَلاَةُ الرَّجُلِ قَاعِداً نِصْفُ الصَّلاَةِ. (صحیح بخاری، کتاب صلاۃ المسافرین، باب جواز النافلۃ قائماً و قاعداً، حدیث: ۷۳۵)

''بیٹھ کر نماز پڑھنے کا ثواب آدھی نماز کے برابر ہے۔''

نماز تہجد کی باجماعت ادائی

سوال: کیا ہم عورتیں نمازِ تہجد مسجد میں امام کے پیچھے پڑھ سکتی ہیں؟

جواب: نماز تہجد کی بڑی فضیلت قرآن وحدیث میں مذکور ہے۔لیکن اس کی ادائی رات کے پچھلے پہر، گھر میں، تنہا کرنی چاہیے۔اگر چہ اسے مسجد میں، باجماعت بھی ادا کرنا جائز ہے۔

جہاں تک عورتوں کا معاملہ ہے، ان کے لیے عام نمازیں گھر میں پڑھنا بہتر ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لاَ تَمْنَعُوا نِسَاءَ كُمُ الْمَسَاجِدَ، وَ بُيُوتُهُنَّ خَيْرٌ لَّهُنَّ. (سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب ماجاء فی خروج النساء الی المساجد، حدیث: ٥٦٧)

''اپنی عورتوں کو مسجد میں جانے سے نہ روکو، البتہ ان کے گھر ان کی ادائی نماز کے لیے زیادہ بہتر ہیں۔''

اس لیے ان کا نمازِ تہجد گھر میں تنہا پڑھنا بہ درجۂ اولیٰ بہتر ہوگا۔

نمازِ وتر کی رکعتیں

سوال: ہم عشاء میں نماز وتر تین رکعت پڑھتے ہیں۔سنا ہے ایک سے دس رکعت تک نماز وتر پڑھی جاسکتی ہے۔یہ کہاں تک صحیح ہے؟ کیا ایک رکعت وتر بھی پڑھی جاسکتی ہے؟

جواب: نبی کریم ﷺ سے وتر کی ایک، تین، پانچ، سات، نو اور گیارہ رکعتیں ثابت ہیں۔ احادیث میں اس کی تفصیل مذکور ہے۔بعض فقہاء (مالکیہ، شوافع اور حنابلہ) صرف ایک رکعت وتر پڑھنا خلافِ اولیٰ قرار دیتے ہیں۔ اہلِ حدیث علما کے نزدیک صرف ایک رکعت بھی بلا کراہیت پڑھی جاسکتی ہے۔ احناف کے نزدیک وتر کی تین رکعتیں ہیں۔اس کے پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ دوسری رکعت میں بیٹھ کر تشہد پڑھا جائے، لیکن سلام نہ پھیرا جائے، بلکہ کھڑے ہوکر تیسری رکعت پڑھی جائے۔

بعض نمازوں کا مخصوص طریقہ

سوال: شب معراج اور شب برأت میں مخصوص طریقے سے نماز ادا کی جاتی ہے۔ قل ھو اللّٰہ احد یا دوسری سورتیں ہر رکعت میں مخصوص تعداد میں پڑھی جاتی ہیں۔اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: شبِ معراج اور شبِ برأت کی فضیلت سے متعلق جتنی روایات ہیں، تقریباً سب پر محدثین نے کلام کیا ہے۔ ان فضیلتوں کی وجہ سے ہی ان راتوں میں عبادت کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ جہاں تک مخصوص طریقے سے نماز ادا کرنے کا معاملہ ہے۔ یعنی قل ھو اللّٰہ احد یا کوئی دوسری سورت ہر رکعت میں متعین تعداد میں پڑھی جائے، تو یہ بھی سنت سے ثابت نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ نوافل کی ادائی اسی طریقے پر کی جائے، جس طرح اللہ کے رسول ﷺ کا معمول تھا۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ.

(صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافر، حدیث: ٦٣١)

''نماز اسی طرح پڑھو، جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔''

صلوٰۃ التسبیح کی شرعی حیثیت

سوال: صلوٰۃ التسبیح مخصوص طریقے سے ادا کی جاتی ہے۔ اس میں متعین تعداد میں تسبیحات پڑھی جاتی ہیں۔ ان کی شرعی حیثیت کیا ہے اور صلوٰۃ التسبیح پڑھنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

جواب: بعض روایات میں صلوٰۃ التسبیح کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے اور اس پر بہت اجر و ثواب بتایا گیا ہے۔ حضرت عکرمہؒ اپنے استاد حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے باپ حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ سے فرمایا: ''اے میرے چچا! کیا میں آپ کو ایک خاص چیز نہ دوں؟ کیا میں آپ کو دس ایسی چیزیں نہ بتاؤں کہ اگر آپ انھیں اختیار کرلیں تو اللہ تعالیٰ آپ کے شروع اور آخر کے، پرانے اور نئے، عمداً کیے ہوئے اور غلطی سے کیے ہوئے، چھوٹے بڑے، علانیہ اور پوشیدہ تمام گناہ معاف کردے۔'' اس کے بعد آپؐ نے صلوٰۃ التسبیح کا طریقہ بتایا، پھر آخر میں فرمایا: ''اگر آپ یہ نماز ہر روز پڑھ سکتے ہوں تو پڑھیے، اگر ہفتہ میں ایک بار پڑھ سکتے ہوں تو پڑھیے، اگر سال میں ایک مرتبہ پڑھ سکتے ہوں تو پڑھیے اور اگر عمر بھر میں ایک مرتبہ پڑھ سکتے ہوں تو پڑھیے۔'' اس روایت کے مطابق صلوٰۃ التسبیح کا، جو طریقہ آں حضرت ﷺ نے اپنے چچا کو بتایا تھا وہ یہ ہے: ''آپ چار رکعت نماز پڑھیں، ہر رکعت میں

سورۂ فاتحہ اور کوئی دوسری سورہ پڑھیں۔ پہلی رکعت میں قرأت سے فارغ اور قیام کی حالت میں ہوں تو پندرہ مرتبہ یہ دعا پڑھیں: سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ ولا الہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر۔ پھر رکوع کیجیے اور اس میں یہی دعا دس مرتبہ پڑھیے، پھر رکوع سے سر اٹھائیے اور دس مرتبہ یہی دعا پڑھیے، پھر سجدہ کیجیے اور دس مرتبہ یہی دعا پڑھیے، پھر سجدہ سے سر اٹھا کر بیٹھیے اور دس مرتبہ یہی دعا پڑھیے، پھر دوسرا سجدہ کیجیے اور دس مرتبہ یہی دعا پڑھیے، پھر سجدہ سے سر اٹھا کر بیٹھیے۔ گویا ہر رکعت میں آپ پچھتر مرتبہ یہ دعا پڑھیے، پھر دوسری، تیسری اور چوتھی رکعت میں بھی آپ پچھتر مرتبہ یہی دعا پڑھیے۔'' یہ روایت سنن ابی داؤد (کتاب التطوع، باب صلاۃ التسبیح، حدیث: ۱۲۹۷)، سنن ابن ماجہ (ابواب اقامۃ الصلوٰۃ، باب ماجاء فی صلاۃ التسبیح، حدیث: ۱۳۸۶، ۱۳۸۷) کے علاوہ صحیح ابن خزیمہ، معجم طبرانی اور سنن بیہقی میں بھی مروی ہے۔ علامہ البانی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ محدث سندی فرماتے ہیں: بعض حفاظِ حدیث نے اس حدیث پر کلام کیا ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث ثابت ہے، اس پر عمل کیا جا سکتا ہے (والصحیح انہ حدیث ثابت ینبغی للناس العمل بہ)۔

سوال: 'صلوٰۃ التسبیح کی شرعی حیثیت' کے زیرِ عنوان اس کی افضلیت کی رائے ظاہر کی گئی ہے اور اس سلسلے میں وارد حدیث کے بارے میں کہا گیا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث ثابت ہے اور اس پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ الموسوعۃ الفقہیۃ کویت کی جلد ۲۷، ص: ۱۵۰-۱۵۱ پر بحث کے بعد تیسرا قول اس کے غیر مشروع کا بھی ہے، جیسا کہ رقم ہے:

الحکم التکلیفی: اختلف الفقہاء فی حکم صلاۃ التسبیح، و سبب اختلافھم فیھا اختلافھم فی ثبوت الحدیث الوارد فیھا: القول الاول: قال بعض الشافعیۃ: ھی مستحبۃ، و قال النووی فی بعض کتبہ: ھی سنۃ حسنۃ...

القول الثانی: ذھب بعض الحنابلۃ الی أنھا لا بأس بھا، و ذلک یعنی الجواز...

والقول الثالث: أنھا غیر مشروعۃ. قال النووی فی المجموع: فی استحبابھا نظر لأن حدیثھا ضعیف و فیھا

تغيير لنظم الصلاة المعروف فينبغى الاّ يفعل بغير حديث و ليس حديثها ثابت، و نقل ابن قدامة ان أحمد لم يثبت الحديث الوارد فيها ولم يرها مستحبة. قال: و قال أحمد: ما تعجبنى، قيل له، لم؟ قال: ليس فيها شيء يصحّ، و نفض يده كالمنكر.

والحديث الوارد فيها جعله ابن الجوزى من الموضوعات. و قال ابن حجر فى التلخيص الحبير، ج:۲، ص:۷۰، **الحق أن طرقه كلها ضعيفة..... قال: و قد ضعفها ابن تيمية والمزّى، و توقف الذهبى، حكاه ابن عبد الهادى فى احكامه. ولم نجد لهذه الصلاة ذكرًا فيما اطّلعنا عليه من كتب الحنفية والمالكية، الاّ ما نقل فى التلخيص الحبير، عن ابن العربى أنه قال: ليس فيها حديث صحيح ولا حسن.** (الموسوعة الفقهية ج:۲۷، ص:۱۵۰-۱۵۱)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ صلوٰۃ التسبیح کی شرعی حیثیت محل نظر ہے، اس لیے مطلق اس کے استحباب پر حکم نہیں لگایا جاسکتا۔

بہ راہ کرم اس سلسلے میں وضاحت فرمائیں۔

جواب: الموسوعة الفقهية میں صلاة التسبيح کے بارے میں مفصل بحث موجود ہے۔ اس کے مطابق فقہاء کے تین گروہ ہیں۔ ایک گروہ اسے مستحب قرار دیتا ہے، دوسرا اس کے جواز کا قائل ہے اور تیسرا اسے غیر مشروع کہتا ہے۔ فقہاء کا یہ اختلاف اس بات پر مبنی ہے کہ اس کی فضیلت سے متعلق، جو حدیث مروی ہے وہ صحیح ہے یا نہیں؟ علماء و محدثین کا ایک گروہ اسے صحیح قرار دیتا ہے تو دوسرا گروہ اسے ضعیف یا موضوع کہتا ہے۔ الموسوعة الفقهية میں دونوں گروہوں کا ذکر ہے۔ آپ نے غیر مشروع قرار دینے والوں کے اقوال تو پورے نقل کر دیے ہیں، لیکن صحیح

قرار دینے والوں کے اقوال، جو الموسوعة الفقهية میں درج کیے گئے تھے۔ حذف کر دیے۔ سطور ذیل میں انھیں بھی نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

قالوا: و قد ثبت هٰذا الحديث من هذه الرواية، و هو ان كان من رواية موسٰى بن عبدا لعزيز فقد وثّقه ابن معين، و قال النسائي: ليس به بأس، و قال الزركشي: الحديث صحيح و ليس بضعيف، و قال ابن الصلاح: حديثها حسن و مثله قال النووي في تهذيب الأسماء واللغات. و قال المنذري: رواته ثقات.

(الموسوعة الفقهية، ج۲۷، ص ۱۵۰-۱۵۱)

''(صلوٰۃ التسبیح کو مستحب قرار دینے والوں نے سنن ابی داؤد میں مروی، جس حدیث سے استدلال کیا ہے، اس کے بارے میں) وہ کہتے ہیں: یہ حدیث اس سند سے ثابت ہے۔ اس میں اگر چہ ایک راوی موسیٰ بن عبدالعزیز ہیں (جن پر بعض علماء نے کلام کیا ہے) لیکن ابن معین نے انھیں ثقہ قرار دیا ہے اور نسائی نے فرمایا ہے کہ ان کی روایت قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ زرکشی فرماتے ہیں: یہ حدیث صحیح ہے، ضعیف نہیں ہے، ابن الصلاح نے لکھا ہے: صلوٰۃ التسبیح والی حدیث حسن ہے۔ ایسی ہی بات نووی نے تہذیب الاسماء واللغات میں لکھی ہے۔ منذری فرماتے ہیں: اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں۔''

جب کسی حدیث کی صحت وعدم صحت کے بارے میں محدثین کے دو گروہ ہوں۔ ایک اس کو صحیح قرار دیتا ہو اور دوسرا غیر صحیح، تو اتنی آسانی سے اس حدیث کو بے اصل اور اس پر مبنی حکم کو غیر مشروع قرار نہیں دیا جا سکتا۔

صلوٰۃ التسبیح کی حدیث کن کن کتب حدیث میں آئی ہے اور اس پر محدثین نے کیا بحثیں کی ہیں، انھیں سطور ذیل میں نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

صحاح ستہ میں سنن ابی داؤد اور سنن ابن ماجہ کے علاوہ یہ سنن ترمذی میں بھی مروی

ہے۔ملاحظہ کیجیے ابواب الصلاۃ، باب ماجاء فی صلاۃ التسبیح، حدیث: ٤٨٢

امام ترمذی نے لکھا ہے کہ صلاۃ التسبیح کی حدیث حضرت ابن عباسؓ کے علاوہ حضرت انس بن مالکؓ، حضرت عبداللہ بن عمروؓ، حضرت فضل بن عباسؓ اور حضرت ابورافعؓ سے بھی مروی ہے۔وہ مزید فرماتے ہیں:

وقد روی عن النبی ﷺ غیر حدیث فی صلاۃ التسبیح، ولا یصحّ منه کبیر شیء، و قد رأی ابن المبارک و غیر واحد من اهل العلم صلاۃ التسبیح، و ذکروا الفضل فیه. (ترمذی، حوالۂ سابق)

''صلاۃ التسبیح کے بارے میں نبی ﷺ سے ایک سے زائد حدیثیں مروی ہیں۔ان میں سے زیادہ تر صحیح نہیں ہیں۔ابن المبارکؒ اور متعدد اصحاب علم صلوٰۃ التسبیح کے قائل ہیں اور انھوں نے اس کی فضیلت بیان کی ہے۔''

فقہ السنہ اسلامی فقہ کے عصری لٹریچر کی ایک اہم اور قابل ذکر کتاب ہے۔اس کے مصنف مشہور اخوانی السید سابق ہیں۔انھوں نے صلوٰۃ التسبیح کا اثبات کرکے دلیل میں وہی حدیث پیش کی ہے، جو اوپر ذکر کی گئی ہے اور اس کا یہ حکم بیان کیا ہے:

رواہ ابو داؤد و ابن ماجة وابن خزیمة فی صحیحه والطبرانی. قال الحافظ: و قد روی هذا الحدیث من طرق کثیرة و عن جماعة من الصحابة، و أمثلها حدیث عکرمة هذا، و قد صحّحه جماعة، منهم الحافظ ابوبکر الآجری و شیخنا ابو محمد عبد الرحیم المصری و شیخنا الحافظ ابو الحسن المقدسی رحمهم اللّٰه. قال ابن المبارک: صلاۃ التسبیح مرغّب فیها. یستحب ان یعتادها فی کل حین ولا یتغافل عنها. (فقه السنة، السید سابق، ص ٢١٢)

''اس حدیث کو ابوداؤد، ابن ماجہ، ابن خزیمہ (نے اپنی صحیح میں) اور طبرانی نے روایت کیا ہے۔ حافظ (ابن حجر) فرماتے ہیں: یہ حدیث بہت سے طرق سے متعدد صحابہؓ سے مروی ہے۔ ان میں سب سے اچھی عکرمہ کی یہ روایت ہے۔ اسے بہت سے محدثین نے صحیح قرار دیا ہے۔ ان میں حافظ ابوبکر الآجری، ہمارے شیخ ابومحمد عبدالرحیم المصری اور ہمارے شیخ حافظ ابوالحسن المقدسی بھی ہیں۔ ابن المبارکؒ نے فرمایا ہے: صلوٰۃ التسبیح کی ترغیب آئی ہے۔ مستحب یہ ہے کہ ہمہ آں اسے معمول بنالیا جائے اور اس سے غفلت نہ برتی جائے۔''

سنن ابی داؤد کا ایک محقق نسخہ بیت الافکار الدولیۃ ریاض سے شائع ہوا ہے۔ اس میں اس حدیث کے بعد امام سیوطیؒ کے حوالے سے اس کا، جو حکم بیان کیا گیا ہے، اسے بھی نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

قال السيوطى: وأفرط ابن الجوزى فأورد هذا الحديث فى كتاب الموضوعات و اعلّه بموسىٰ بن عبد العزيز، قال انه مجهول، قال الحافظ ابو الفضل بن الحجر فى كتاب الخصال المكفّرة للذنوب المقدمة والمؤخرة: أساء ابن الجوزى بذكر هذا الحديث فى الموضوعات، و قوله ان موسىٰ بن عبد العزيز مجهول لم يُصِب فيه فان ابن معين والنسائى وثّقاه، و قال فى أمالى الأذكار: هذا الحديث أخرجه البخارى فى جزء القراء ة خلف الامام، و ابو داؤد وابن ماجة وابن خزيمة فى صحيحه والحاكم فى مستدركه و صحّحه البيهقى وغيرهم. و قال ابن شاهين فى الترغيب: سمعت أبا بكر ابن داؤد يقول سمعت أبى يقول أصحّ حديث فى صلاة التسبيح هذا. قال: و موسىٰ بن عبدا لعزيز وثّقه ابن معين والنسائى

وابن حبان و روى عنه خلق، أخرج البخارى فى جزء القراء ة هذا الحديث بعينه و أخرج له فى الأدب حديثاً فى سماع الرعد، و ببعض هذه الأمور ترتفع الجهالة، و ممّن صحّح هذا الحديث أو حسّنه غير من تقدّم: ابن منده و ألّف فى تصحيحه كتا باً والآجرى والخطيب و أبو سعد السمعانى و أبو موسىٰ المدينى و أبو الحسن بن المفضل والمنذرى وابن الصلاح والنووى فى تهذيب الأسماء و آخرون، قال الديلمى فى مسند الفردوس: صلاة التسبيح أشهر الصلوات و أصحّها اسنادًا، و روى البيهقى وغيره عن أبى حامد الشرقى قال: كنت عند مسلم بن الحجاج و معنا هذا الحديث فسمعت مسلماً يقول: لا يروى فيها اسناداً أحسن من هٰذا، و قال الترمذى: قد رأى ابن المبارک وغيره من أهل العلم صلاة التسبيح و ذكروا الفضل فيها. و قال البيهقى: كان عبد اللّٰه بن المبارک يصلّيها و تداولها الصالحون بعضهم عن بعض، و فيه تقوية للحديث المرفوع.

''سیوطی نے فرمایا ہے: ابن الجوزی نے اس حدیث کو کتاب الموضوعات میں شامل کر کے زیادتی کی ہے۔ انھوں نے اس کی علّت موسیٰ بن عبدالعزیز کو قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ وہ مجہول ہیں۔ حافظ ابن حجر نے اپنی کتاب الخصال المکفّرۃ میں لکھا ہے: ابن الجوزی نے اس حدیث کو کتاب الموضوعات میں درج کر کے برا کیا۔ ان کا یہ کہنا کہ موسیٰ بن عبدالعزیز مجہول ہیں، صحیح نہیں۔ اس لیے کہ ابن معین اور نسائی نے انھیں ثقہ قرار دیا ہے۔ ابن حجر نے اُمالی الأذکار میں لکھا ہے: اس حدیث کو امام بخاری نے (جزء القراء ۃ خلف الامام میں) ابوداؤد، ابن ماجہ اور ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں

اور حاکم نے اپنی مستدرک میں بیان کیا ہے۔ بیہقی اور دیگر محدثین نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ ابن شاہین نے الترغیب میں لکھا ہے: میں نے ابوبکر بن ابی داؤد کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: ''میرے باپ بیان کرتے تھے کہ صلوٰۃ التسبیح کے سلسلے میں سب سے صحیح حدیث یہی ہے۔'' انھوں نے یہ بھی لکھا ہے: موسیٰ بن عبدالعزیز کو ابن معین، نسائی اور ابن حبان نے ثقہ قرار دیا ہے اور ان سے بہت سے لوگوں نے روایت کی ہے۔ بخاری نے جزء القراءۃ میں بعینہ اس حدیث کی تخریج کی ہے اور الأدب میں سماع رعد کے موضوع پر ایک حدیث موسیٰ بن عبدالعزیز کی سند سے بیان کی ہے۔ ان امور سے موسیٰ بن عبدالعزیز مجہول نہیں رہتے۔ دیگر جن حضرات نے اس حدیث کو صحیح یا حسن قرار دیا ہے ان میں ابن مندہ (جنھوں نے اس کی صحت پر بحث کرتے ہوئے پوری ایک کتاب لکھی ہے) آجری، خطیب، ابوسعد السمعانی، ابوموسیٰ المدینی، ابوالحسن بن المفضل، منذری، ابن الصلاح، نووی (تہذیب الاسماء) اور دیگر محدثین شامل ہیں۔ دیلمی نے مسند فردوس میں لکھا ہے: صلوٰۃ التسبیح مشہور نماز ہے اور اس سلسلے میں مروی حدیث کی سند صحیح ترین ہے۔ بیہقی اور دیگر نے ابوحامد شرقی کا یہ قول نقل کیا ہے ''میں مسلم بن حجاج کے پاس تھا۔ اس وقت یہی حدیث ہمارے درمیان زیر بحث تھی۔ انھوں نے فرمایا: اس موضوع پر مروی احادیث میں سب سے اچھی سند اسی حدیث کی ہے۔'' ترمذی نے فرمایا: ابن المبارک اور دیگر اصحاب علم صلوٰۃ التسبیح کے قائل ہیں اور انھوں نے اس کی فضیلت بیان کی ہے۔ بیہقی نے فرمایا ہے: عبداللہ بن المبارک یہ نماز پڑھتے تھے۔ بعد میں صالحین میں یہ متداول ہوگئی۔ اس سے مرفوع حدیث کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔''

'جامع الاصول فی احادیث الرسول' محدث ابن الاثیر الجزری (م ۶۰۶ھ) کی مشہور کتاب ہے۔ اس میں انھوں نے حدیث کی امہات الکتب سے مخصوص ترتیب کے ساتھ احادیث جمع کی ہیں۔ سنن ابوداؤد اور سنن ترمذی کے حوالے سے انھوں نے اس حدیث کو بھی نقل کیا ہے۔ اس کتاب کے نصوص کی تحقیق، احادیث کی تخریج اور تعلیق کی خدمت موجودہ دور کے مشہور محقق عبدالقادر الارناؤوط نے انجام دی ہے۔ اس حدیث پر انھوں نے یہ حاشیہ لگایا ہے:

رواه ابو داؤد..... والترمذی..... والحاکم فی المستدرک..... و صحّحه و وافقه الذهبی، و هو حدیث صحیح لطرقه و شواهده الکثیرة، و قد صحّحه جماعة من العلماء. (جامع الاصول، ٦/٢٥٤)

''اس کی روایت ابوداؤد اور ترمذی نے کی ہے اور حاکم نے مستدرک میں اسے بیان کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ ذہبی بھی ان کے ہم خیال ہیں۔ بہت سے طرق اور شواہد کی بنا پر یہ حدیث صحیح ہے۔ بہت سے علماء نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔''

علامہ محمد ناصر الدین الالبانی (م۱۹۹۹) عصر حاضر کے مشہور محدث ہیں۔ تحقیقِ حدیث کے معاملے میں بہت سخت تصور کیے جاتے ہیں۔ مگر انھوں نے بھی اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ سنن ابی داؤد، سنن ترمذی اور سنن ابن ماجہ میں، جن سندوں سے یہ حدیث مروی ہے سب کو انھوں نے صحیح کہا ہے۔ مشکوٰۃ المصابیح میں انھوں نے اس حدیث پر، جو حاشیہ لگایا ہے اسے یہاں نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، لکھتے ہیں:

''اس حدیث کو ابو داؤد (۱۲۹۷) اور ابن ماجہ (۱۳۸۷) نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے۔ اس میں موسیٰ بن عبدالعزیز اور حکم بن ابان ہیں۔ یہ دونوں حافظہ کے پہلو سے ضعیف ہیں۔ حاکم (۱/۳۱۸) پھر ذہبی نے اس کے قوی ہونے کا اشارہ کیا ہے۔ یہی بات صحیح ہے۔ اس لیے کہ اس حدیث کے بہت سے طرق اور شواہد ہیں، جن سے واقفیت رکھنے والے کو قطعی طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ جن لوگوں نے اسے موضوع یا باطل کہا ہے، ان کے برخلاف اس حدیث کی مضبوط بنیاد موجود ہے۔ خطیب بغدادی نے ایک کتاب میں، جو مکتبۂ ظاہریہ دمشق میں بہ صورت مخطوطہ محفوظ ہے، اس کے تمام طرق کو جمع کر دیا ہے۔ علامہ ابوالحسنات (عبدالحی) لکھنوی نے اپنی کتاب الآثار المرفوعة فی الاخبار الموضوعة (ص۳۵۳-۳۷۴) میں اس پر تحقیقی بحث کی ہے، تفصیل کے طالب کو اس سے رجوع کرنا چاہیے۔ ان کی بحث قاری کو اس موضوع پر لکھی جانے والی تمام تحریروں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ انھوں نے اس کے قوی ہونے کا اشارہ اس بات سے بھی کیا ہے کہ اس کے بعد ابورافع والی سند بیان کی ہے۔ اس حدیث کے بارے میں اور

اس موضوع پر دیگر احادیث کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ کے مفصل جوابات ملاحظہ کیجیے، جو اس کتاب کے آخر میں شامل ہیں۔'' (مشکوٰۃ المصابیح، بتحقیق علامہ محمد ناصر الدین الالبانی، ۱/۴۱۹)

صلوٰۃ التسبیح کے موضوع پر مروی حدیث کے بارے میں اتنی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی تاکہ اس حدیث کے بارے میں پایا جانے والا اشکال رفع ہو سکے اور واضح ہو جائے کہ جہاں ایک طرف بعض محدثین نے اس پر کلام کیا ہے اور اس کو ضعیف یا موضوع کہا ہے، وہیں بہت سے پایے کے محدثین نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

مردے کے لیے دعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب

سوال: مردہ کے لیے دعائے مغفرت کے بارے میں مشہور ہے کہ جب کسی آدمی کا انتقال ہوتا ہے تو تین دن ہر صبح اس کی قبر پر جا کر کچھ اذکار اور قرآن کی کچھ سورتیں پڑھ کر دعائے مغفرت کی جاتی ہے۔ پھر واپس آ کر اس کے گھر والوں کی تعزیت کی جاتی ہے۔ مزید یہ کہ فاتحہ پڑھتے وقت اکثر لوگ قبرستان میں ہاتھ اوپر اٹھانے پر اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قبرستان میں ہاتھ اوپر اٹھا کر مردے کے لیے دعائے مغفرت کرنا منع ہے۔ بہ راہ کرم اس سلسلے میں صحیح رہ نمائی فرمائیں اور بتائیں کہ ایصالِ ثواب کے سلسلے میں شریعت کے کیا احکام ہیں؟

جواب: احادیث میں زیارتِ قبور کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سے آخرت کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ لیکن قبر پر جا کر دعائے مغفرت کرنا ضروری نہیں۔ اسی طرح میت کے گھر والوں کی تعزیت کرنا پسندیدہ اور مسنون عمل ہے۔ لیکن کسی مخصوص طریقے کو رواج بنا لینا اور ٹھیک ٹھیک اس کی پابندی کرنا مناسب نہیں ہے۔ قرآن کی کچھ سورتیں پڑھ کر کسی میت کے لیے دعائے مغفرت کرنا یا بعض اعمالِ صالحہ انجام دے کر اس کا ثواب کسی میت کو پہنچانا جائز ہے۔ احادیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ اس موضوع پر مولانا مفتی جمیل احمد نذیری نے اپنی کتاب 'مسئلہ ایصال ثواب' (شائع کردہ مکتبہ صداقت، نوادہ، مبارک پور، اعظم گڑھ) میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس سے رجوع کرنا چاہیے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اکثر بغیر ہاتھ اٹھائے دعا مانگی ہے اور بعض مواقع پر آپؐ سے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا بھی ثابت ہے۔

کرنسی نوٹ میں زکوٰۃ کا نصاب

سوال: زکوٰۃ کے لیے موجودہ کرنسی نوٹ کی مقدار کیا ہے؟ ساڑھے سات تولہ سونا کے برابر یا ۵۲ تولہ چاندی کے برابر کی رقم، معیار سونا ہے یا چاندی؟

جواب: ادائی زکوٰۃ کے لیے فقہاء نے چاندی کو معیار مانا ہے۔ اس میں غریبوں اور مستحقین کی مصلحت اور مفاد پیش نظر ہے۔ جس شخص کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی کی رقم کے برابر کرنسی نوٹ ہوں اس پر زکوٰۃ عائد ہوگی۔

سید خاندان کے لیے حرمتِ زکوٰۃ کی حکمت

سوال: زکوٰۃ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سید خاندان کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔ یعنی اس خاندان کے لوگوں کے لیے صدقہ یا زکوٰۃ لینا حرام ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: تمام فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے خاندان بنو ہاشم کے لیے زکوٰۃ جائز نہیں ہے۔ آں حضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الصَّدَقَةَ لاَ تَنْبَغِي لِآلِ مُحَمَّدٍ اِنَّمَا هِيَ اَوْسَاخُ النَّاسِ.

(صحيح مسلم، كتاب الزكوٰة، باب ترك استعمال آل النبي على الصدقة، حديث: ۱۰۷۲)

''صدقہ (مراد زکوٰۃ) آل محمدؐ کے لیے جائز نہیں ہے یہ لوگوں کا میل کچیل ہے۔''

یہ حرمت بنو ہاشم کے اعزاز و اکرام کی بنا پر ہے۔ الموسوعة الفقهية میں ہے:

حرمة الصدقة على بني هاشم كرامة من الله لهم و لذريتهم حيث نصروه ﷺ في جاهليتهم و اسلامهم.

(۱۰۱/۱)

''بنو ہاشم کے لیے زکوٰۃ کی حرمت اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے اور ان کی نسل کے لیے اعزاز و اکرام کی بنا پر ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے عہد جاہلیت اور عہد اسلامی میں آں حضرت ﷺ کی نصرت و حمایت کی تھی۔''

بعض فقہاء کا خیال ہے کہ حرمت صرف عہد نبوی کے لیے تھی۔ اب سادات کو بھی زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ تفصیلات کتب فقہ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

زیورات پر زکوٰۃ

سوال: میرا تعلق درمیانی طبقہ سے ہے۔ میری شادی کو ایک سال سے کچھ زائد ہو چکا ہے۔ مجھے اپنی شادی میں اتنے زیورات ملے تھے، جن پر زکوٰۃ نکالنا فرض ہو جاتا ہے۔ زیورات پر زکوٰۃ کے سلسلے میں جب میں نے اپنے شوہر محترم سے رجوع کیا تو انھوں نے مجھے ایک عجیب سی الجھن میں ڈال دیا۔ کہنے لگے کہ زیورات آپ کی ملکیت ہیں۔ ان کی زکوٰۃ آپ ہی کو نکالنی ہے۔ انھوں نے مہر کی رقم ادا کر دی تھی۔ میں نے اس رقم کو بھی زیورات میں تبدیل کر لیا تھا۔ سسرال میں میرے پاس اپنی کوئی جائیداد تو ہے نہیں۔ میری ساری جمع پونجی یہی زیورات ہیں۔ ان کی زکوٰۃ کس طرح نکالوں، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ زکوٰۃ کے لیے درکار پیسے کہاں سے لاؤں؟ والدین کی طرف بھی رجوع نہیں کر سکتی، کیوں کہ وہ اپنی ضرورتیں بھی بڑی مشکل سے پوری کر پاتے ہیں۔

یہ اکیلے میرا مسئلہ نہیں ہے۔ درمیانی طبقے کی ہماری زیادہ تر بہنوں کے پاس اپنے زیورات کے علاوہ اور کوئی جائداد تو ہوتی نہیں ہے۔ ہم اپنے زیورات بیچ کر ہی ان کی زکوٰۃ ادا کر سکتی ہیں۔ اس طرح چند سالوں میں ان کی مالیت اتنی کم ہو جائے گی کہ زیورات کا اصل مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ درمیانی طبقے کی خواتین کے لیے یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ زکوٰۃ نہ نکالنے پر احساسِ گناہ کے ساتھ زیورات کو زیب تن کرنا ان کا مقدّر بن جاتا ہے۔

اس سلسلے میں دو سوالات جواب طلب ہیں:

(۱) کیا بیوی کی ملکیت والے زیورات کی زکوٰۃ نکالنا شوہر پر فرض نہیں ہے؟

(۲) اگر شوہر سے الگ بیوی کے پاس اپنی جداگانہ ملکیت ہو تو کیا اسلام میں اسے اپنی جائداد کے انتظام کی وہی آزادی حاصل ہے، جو شوہر کو اپنی جائداد کے لیے حاصل ہے؟

جواب: مال دار اور صاحبِ حیثیت مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض ہے۔ جن چیزوں پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے ان میں سونا، چاندی، کھیتی، پھل، اموال تجارت اور جانور وغیرہ ہیں۔ استعمالی چیزوں

مثلاً زمین، مکان اور گھریلو ساز وسامان وغیرہ پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ عورتیں زیب وزینت کے لیے سونے چاندی کے، جو زیورات بنوالیتی ہیں ان پر زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں علماء کا اختلاف ہے۔ یہ اختلاف صحابہ وتابعین کے زمانے میں بھی تھا۔ حضراتِ صحابہ میں ابن عمرؓ، جابرؓ، عائشہؓ، انسؓ اور اسماء بنت ابی بکرؓ اور تابعین ومتاخرین میں قاسمؒ، شعبیؒ، قتادہؒ، محمد بن علیؒ، عمرہؒ، ابوعبیدہؒ، اسحاقؒ اور ابوثورؒ اور فقہائے اربعہ میں امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ زیورات میں زکوٰۃ کے عدم وجوب کے قائل ہیں۔ یہ حضرات آثارِ صحابہ سے استدلال کرتے ہیں:

حضرت عائشہؓ اپنی بھتیجیوں کو، جو ان کے زیر پرورش تھیں، سونے کے زیورات پہناتی تھیں، مگر ان کی زکوٰۃ نہیں نکالتی تھیں۔ (موطا امام مالك، كتاب الزكوٰة، باب مالا زكوٰة فيه من الحلى والتبر والعنبر، حديث: ۱۰۴۹) حضرت نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنی صاحب زادیوں اور لونڈیوں کو سونے کے زیورات پہناتے تھے، مگر ان کی زکوٰۃ نہیں نکالتے تھے۔ (موطا امام مالک، حوالۂ سابق) اسی طرح حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کے بارے میں بھی مروی ہے کہ وہ اپنی لڑکیوں کو سونے کے زیورات پہناتی تھیں، مگر ان کی زکوٰۃ نہیں نکالتی تھیں۔ (بیہقی) حضرت جابر بن عبداللہؓ سے کسی نے پوچھا: کیا زیورات میں زکوٰۃ ہے؟ انھوں نے جواب دیا: نہیں۔ پوچھنے والے نے پھر دریافت کیا: خواہ ان کی مالیت ایک ہزار دینار کو پہنچ جائے؟ فرمایا: خواہ اس سے زیادہ ہوجائے۔ (بیہقی)

لیکن صحابہ، تابعین اور فقہاء کی دوسری جماعت زیورات میں زکوٰۃ واجب قرار دیتی ہے۔ ان میں عمر بن الخطابؓ، ابن مسعودؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، سعید بن المسیبؒ، سعید بن جبیرؒ، عطاؒ، مجاہدؒ، عبداللہ بن شدادؒ، جابر بن زیدؒ، ابن سیرینؒ، میمون بن مہرانؒ، زہریؒ، ثوریؒ اور فقہائے اربعہ میں سے امام ابوحنیفہؒ قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات کا استدلال درج ذیل احادیث نبوی سے ہے:

(۱) حضرت عبداللہ بن شدادؒ فرماتے ہیں: ہم ام المومنین حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے فرمایا: ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے۔ آپ نے میرے ہاتھوں میں چاندی کے چھلّے (بغیر نگینے کی انگوٹھیاں) دیکھے تو فرمایا: یہ کیا ہے عائشہ؟ میں

نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! میں نے انھیں آپ کے لیے زینت اختیار کرنے کے مقصد سے پہنا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: کیا ان کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو؟ میں نے عرض کیا: نہیں (یا فرمایا کہ تھوڑا بہت دے دیتی ہوں)۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: جہنم کی آگ سے محفوظ رہنے کے لیے ان کی زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔ (سنن ابی داؤد، کتاب الزکاۃ، باب الکنز ما ھو و زکوٰۃ الحلی، حدیث: ۱۵۶۵، اسے دار قطنی، حاکم اور بیہقی نے بھی روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح کی شرط پر ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے، بہ حوالہ: جامع الاصول، ۴/۶۰۹)

(۲) عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے ایک روایت ہے کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اپنی ایک لڑکی کے ساتھ حاضر ہوئی۔ اس لڑکی کے ہاتھ میں سونے کے دو موٹے کنگن تھے۔ آں حضرت ﷺ نے فرمایا: کیا تم اس کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو؟ اس نے جواب دیا: نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تمھیں اچھا لگے گا کہ اللہ تعالیٰ روزِ قیامت اس کے بدلے جہنم کی آگ کے کنگن پہنائے؟ یہ سن کر اس نے دونوں کنگن اتار کر نبی ﷺ کے آگے رکھ دیے اور کہا: یہ اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہیں۔'' (سنن ابی داؤد، کتاب الزکاۃ، باب الکنز ما ھو و زکاۃ الحلی، حدیث: ۱۵۶۳، سنن نسائی، کتاب الزکاۃ، باب زکاۃ الحلی، حدیث: ۲۴۷۹)

اسی سے ملتے جلتے مضمون کی ایک حدیث امام ترمذیؒ نے بھی روایت کی ہے۔ (جامع ترمذی، ابواب الزکاۃ، باب ماجاء فی زکوۃ الحلی، حدیث: ۶۳۷)

(۳) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زوجہ حضرت زینبؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ ہمارے درمیان خطبہ دیا تو فرمایا:

تَصَدَّقْنَ يَا مَعْشَرَ النِّسَآءِ وَ لَوْ مِنْ حُلِيِّكُنَّ. (صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، باب الزکاۃ علی الزوج، حدیث: ۱۴۶۶، صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب فضل النفقۃ و الصدقۃ علی الاقربین، حدیث: ۱۰۰۰)

''اے عورتو! صدقہ کرو، خواہ تمھیں اپنے زیورات ہی میں سے کرنا پڑے۔''

(۴) عطاء بن ابی رباحؒ فرماتے ہیں کہ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں: میں سونے کے زیورات پہنا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت کیا: کیا

ان کا شمار بھی اس مال پر ہوگا، جس کے جمع کرنے پر عذاب کی خبر دی گئی ہے۔ آں حضرت ﷺ نے فرمایا: اگر ان کی زکوٰۃ ادا کردی جائے تو ان کا شمار ایسے مال میں نہیں ہوگا۔'' (سنن ابی داؤد، کتاب الزکاۃ باب الکنز ما ھو و زکاۃ الحلی، حدیث: ١٥٦٤)

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ زیورات کی زکوٰۃ نکالنی واجب ہے۔ یہ احادیث مرفوع ہیں اور وجوبِ زکوٰۃ کے بارے میں زیادہ صریح ہیں۔ اسی لیے امام خطابیؒ نے فرمایا ہے:

''کتاب اللہ میں مال و دولت جمع کرنے اور اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے پر عذاب کی خبر دی گئی ہے۔ (التوبہ:۳۴) اس سے ان لوگوں کے قول کو تقویت ملتی ہے، جو زیورات پر زکوٰۃ کے وجوب کے قائل ہیں اور روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ جن لوگوں نے زیورات پر زکوٰۃ کو ساقط کیا ہے انھوں نے استعمالی چیزوں پر زکوٰۃ کے عدم وجوب پر قیاس کیا ہے۔ ان کی تائید میں چند آثارِ صحابہ ہیں۔ اس لیے احتیاط کا تقاضا ہے کہ زیورات پر زکوٰۃ ادا کی جائے۔'' (بہ حوالہ فقہ السنہ، السید سابق، ۱/۳۴۳)

زیورات اگر بیوی کی ملکیت ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کی زکوٰۃ بھی اسے ہی ادا کرنی ہے۔ بیوی کی ملکیت والے زیورات کی زکوٰۃ کی ادائی شوہر کے ذمے کیوں کر ہوگی؟ اسلام نے عورت کو ملکیت کا حق دیا ہے۔ اسے اپنے مائیکے یا دیگر اعزہ سے، جو چیزیں ملیں، خواہ وہ زیورات ہوں، زمین جائیداد ہو، مکان ہو یا کچھ اور، وہ اس کی مالک ہے اور اسے اس کا انتظام کرنے اور دیکھ بھال کرنے، اس سے فائدہ اٹھانے اور اس میں تصرف کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔

زیورات پر زکوٰۃ ادا کرنے کا ارادہ ہو تو بہ آسانی اس کا نظم کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے، خواتین پورے سال تہی دست نہیں ہوتیں۔ انھیں نجی خرچ کے لیے اپنے شوہروں سے اور دیگر ذرائع سے کچھ نہ کچھ رقم ملتی رہتی ہے۔ وہ اس میں سے تھوڑا تھوڑا پس انداز کر کے اتنی رقم اکٹھا کرسکتی ہیں کہ اپنے زیورات کی زکوٰۃ ادا کرسکیں۔ لیکن اگر وہ مختلف ذرائع سے ملنے والی رقم کو بھی زیورات میں تبدیل کرتی رہیں گی تو ادائی زکوٰۃ کے لیے ان کے پاس کچھ نہ بچے گا اور زکوٰۃ نہ نکالنے پر احساسِ گناہ کے ساتھ زیورات کو زیب تن کرنا ان کا مقدّر بنا رہے گا۔

سوال: میرے پاس کچھ زیورات ہیں، جنھیں میں نے عرصے سے استعمال نہیں کیا۔ وہ لاکر (Locker) میں رکھے ہیں۔ کیا اس مدت کی زکوٰۃ بھی ادا کرنی ہوگی؟

جواب: سونے چاندی کے زیورات، جو استعمال اور زینت کے لیے ہوں، ان پر زکوٰۃ کے سلسلے میں اختلاف ہے۔ یہ اختلاف عہدِ صحابہ سے رہا ہے۔ فقہائے ثلاثہ (امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ) کے نزدیک ان پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہؒ ان پر بھی زکوٰۃ کی فرضیت کے قائل ہیں۔

یہ زیورات خواہ زیرِ استعمال ہوں یا لاکر میں رکھے ہوں، امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کی رو سے دونوں صورتوں میں ان کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

چاند دیکھ کر افطار کرنا

سوال: ایک صاحب نے چاند دیکھ کر افطار کیا، حالاں کہ ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا، بلکہ عصر ہی کا وقت تھا۔ اگر چاند دیکھ کر روزہ رکھنا ہے اور چاند دیکھ کر افطار کرنا ہے تو پھر قرآن کی اس آیت کا حق کہاں ادا ہوا کہ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى اللَّيْلِ (اپنا روزہ رات تک پورا کرو)۔ جہاں تک روزہ رکھنے کا سوال ہے وہ ماہ رمضان کا چاند نظر آنے پر ہی رکھا جاتا ہے۔ لیکن اگر ماہ رمضان کی آخری تاریخ کو شوال کا چاند سورج غروب ہونے سے پہلے یا عصر کے وقت ہی دکھائی دے تو کیا اسی وقت افطار کرنا چاہیے، یا پھر معمول کی طرح سورج غروب ہونے کے بعد افطار کرنا چاہیے؟ بہ راہ کرم اس سلسلے میں مکمل رہ نمائی فرمائیں۔

جواب: روزہ کی مدت طلوعِ فجر سے غروبِ آفتاب تک ہے۔ قرآن کریم کی اس آیت میں، جس کا ایک حصہ آپ نے بھی نقل کیا ہے، اس کی صراحت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى اللَّيْلِ ۚ

(البقرہ:۱۸۷)

''(راتوں کو) کھاؤ پیو، یہاں تک کہ تم کو سیاہی شب کی دھاری سے سپیدۂ صبح کی دھاری نمایاں نظر آجائے۔ تب (یہ سب کام چھوڑ کر) رات تک اپنا روزہ پورا کرو۔''

جن صاحب کا آپ نے تذکرہ کیا ہے، غالباً انھیں غلط فہمی ایک حدیث کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ماہِ رمضان کے آغاز واختتام کے سلسلے میں فرمایا:

اِذَا رَأَیْتُمُوْهُ فَصُوْمُوْا وَ اِذَا رَأَیْتُمُوْهُ فَاَفْطِرُوْا.

(صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب هل یقال رمضان أو شهر رمضان، حدیث: ۱۹۰۰، صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب فضل شهر رمضان، حدیث: ۱۰۸۰)

''چاند دیکھ کر روزہ شرع کرو اور چاند دیکھ کر روزہ ختم کرو۔''

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ چاند دیکھتے ہی افطار کرلو، بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ چاند دیکھ لو تو اگلے دن روزہ نہ رکھو۔ جس طرح رمضان کا چاند دیکھتے ہی فوراً روزہ نہیں شروع ہوجاتا، بلکہ اس کا آغاز اگلے دن طلوع فجر سے ہوتا ہے، اسی طرح شوال کا چاند اگر غروب آفتاب سے کچھ دیر قبل نظر آجائے تو فوراً روزہ نہیں ختم کردیا جائے گا، بلکہ غروبِ آفتاب تک انتظار کرنا ہوگا۔

شوہر کے ساتھ حج

سوال: اگر مجھے حج پر جانا ہو تو کیا ضروری ہے کہ اس کے لیے پیسوں کا انتظام میں خود کروں، بہ الفاظ دیگر کیا اپنے پیسوں ہی سے میں حج کرسکتی ہوں؟ واضح کردوں کہ میرے گھر میں ایسا معاملہ نہیں ہے کہ میرے پیسے یا میری پراپرٹی الگ ہو۔ جو کچھ شوہر کا ہے وہی میرا بھی مانا جاتا ہے۔ اگر شوہر انتظام کرکے مجھے حج پر لے جائیں تو کیا میں یہ حج کرسکتی ہوں؟

جواب: حج اس پر فرض ہے، جو اس کی استطاعت رکھتا ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلاً ط

(آل عمران: ۹۷)

''لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے۔''

استطاعت سے مراد یہ ہے کہ انسان کے پاس اپنی گھریلو ضروریات کے علاوہ اتنا مال ہو، جو اس کے مصارفِ سفر کے لیے کافی ہو اور کوئی ذریعۂ سفر بھی فراہم ہو۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! حج کب فرض ہوتا ہے؟ فرمایا: اَلزَّادُ وَالرَّاحِلَةُ ''جب زادِراہ اور سواری کا انتظام ہو۔'' (جامع ترمذی، ابواب الحج، باب ماجاء فی ایجاب الحج بالزاد والراحلة، حدیث نمبر: ۸۱۳ اس حدیث کو امام ترمذی نے حسن اور علامہ البانی نے ضعیف قرار دیا ہے)

عورت کے لیے استطاعت کے مفہوم میں ایک چیز اور شامل ہے کہ حج کے سفر میں اس کے ساتھ شوہر یا کوئی محرم ہو۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو مال دار ہونے کے باوجود عورت پر حج فرض نہیں ہے۔

یہ تو فرضیتِ حج کا معاملہ ہے۔ حج دوسرے کے مصارف پر کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً: بیٹے پیسوں کا انتظام کر کے ماں باپ کو حج پر بھیجیں، یا شوہر اپنے ساتھ بیوی کو بھی لے جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

کیا آبِ زم زم کھڑے ہو کر پینا مسنون ہے؟

سوال: گزشتہ دنوں سفرِ حج سے واپس آنے والے بعض حضرات کی طرف سے کھجور اور آبِ زم زم کا تحفہ ملا۔ ایک موقعے پر میں نے آبِ زم زم بیٹھ کر پیا، تو ایک صاحب نے ٹوک دیا کہ زم زم کھڑے ہو کر پینا مسنون ہے۔ میں نے اس سلسلے میں تحقیق کی تو بعض کتابوں میں یہ لکھا ہوا پایا کہ زم زم قبلہ رخ کھڑے ہو کر پینا چاہیے۔ لیکن ان میں کوئی شرعی دلیل نہیں دی گئی تھی۔ اس لیے اطمینان نہ ہوسکا۔ بہ راہ کرم اس سلسلے میں تحقیقی جواب مرحمت فرمائیں کہ کیا آبِ زم زم کھڑے ہو کر پینا مسنون ہے؟

جواب: اللہ کے رسول ﷺ سے بیٹھ کر کھانا پینا ثابت ہے۔ حضرت انسؓ، جنھوں نے دس سال تک آں حضرت ﷺ کی خدمت کی ہے، فرماتے ہیں کہ آپؐ نے کھڑے ہو کر پینے سے منع فرمایا ہے۔ اِنَّ النَّبِیَّ ﷺ نَھٰی اَنْ یَّشْرَبَ الرَّجُلَ قَائِمًا۔ (صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب الشرب قائماً، حدیث: ۲۰۲٤) یہ روایت حضرت ابوسعید خدریؓ سے بھی مروی ہے۔ ان دونوں صحابیوں سے مروی ایک روایت کے الفاظ ہیں: اِنَّ النَّبِیَّ ﷺ زَجَرَ عَلَی الشُّرْبِ قَائِماً۔

یعنی نبی ﷺ نے کھڑے ہوکر پینے سے سختی سے منع فرمایا ہے (حوالہ سابق، حدیث:۲۰۲۴، ۲۰۲۵) آں حضرت ﷺ کی یہ ممانعت جہاں عام حالات کے لیے ہے وہیں اس کا تعلق آبِ زم زم سے بھی ہے۔

زم زم کے سلسلے میں غلط فہمی دراصل ایک روایت کی وجہ سے ہوئی ہے۔ حضرت شعبیؒ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے (ایک موقع پر) زم زم کھڑے ہوکر پیا۔ یہ روایت بخاری (۵۶۱۷)، مسلم (۲۰۲۷)، ترمذی (۱۸۸۲) اور ابن ماجہ (۳۴۲۲) میں کتاب الاشربۃ میں آئی ہے۔ دوسری روایت میں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو آبِ زم زم پلایا۔ آپؐ نے اسے قیام کی حالت میں پیا۔ (بخاری: ۱۶۳۷) ایک روایت میں یہ بھی اضافہ ہے کہ آپؐ نے ایک ڈول سے آبِ زم زم نوش فرمایا تھا۔ (مسلم: ۲۰۲۷) حضرت شعبیؒ کے شاگرد عاصم الاحول بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عکرمہؒ (حضرت ابن عباسؓ کے ایک دوسرے شاگرد) کے سامنے بیان کیا کہ حضرت ابن عباسؓ ایسا ایسا کہتے ہیں۔ انھوں نے قسم کھا کر کہا کہ نبی ﷺ نے کھڑے ہوکر نہیں پیا تھا۔ (سنن ابن ماجه، كتاب الاشربة، باب الشرب قائماً، حديث: ٣٤٢٢) بخاری میں عکرمہؒ کا یہ قول مروی ہے کہ ''اس دن آں حضرت ﷺ اونٹ پر سوار تھے۔ (كتاب الحج، باب ماجاء فی زم زم، حديث: ١٦٣٧) یعنی آپؐ نے سواری کی حالت میں زم زم نوش فرمایا تھا۔

حافظ ابن حجرؒ نے دونوں بیانات میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ''سنن ابوداؤد میں ایک دوسری سند سے حضرت عکرمہؒ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اونٹ پر سواری کی حالت میں طواف کیا۔ پھر اونٹ سے اتر کر دو رکعت نماز ادا کی۔ اس لیے ممکن ہے دوبارہ اونٹ پر سوار ہونے سے قبل آپؐ نے کھڑے ہوکر زم زم پیا ہو۔''

(فتح الباری، ۳/۴۹۳، ۱۰/۸۵)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آں حضرت ﷺ کا کھڑے ہوکر زم زم پینا، اس کی کسی فضیلت کی بنا پر تھا یا محض بیانِ جواز کے لیے تھا؟ محدثین اسے بیانِ جواز کے لیے قرار دیتے ہیں۔ امام ترمذیؒ نے اس روایت پر یہ باب قائم کیا ہے: باب ماجاء فی الرخصة فی الشرب

قائماً (اس چیز کا بیان کہ بعض حالات میں کھڑے ہوکر پینے کی رخصت ہے)۔ صحیح مسلم کے شارح امام نوویؒ نے اس پر تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''بعض احادیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے کھڑے ہوکر پینے سے منع فرمایا ہے۔ جب کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے بعض مواقع پر کھڑے ہوکر پیا ہے۔ بعض علماء کے لیے ان احادیث میں تطبیق دشوار ہوگئی ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ آپؐ کی نہی کو کراہتِ تنزیہی پر محمول کرنا چاہیے اور آپؐ کا کھڑے ہوکر پینا بیانِ جواز کے لیے تھا۔ اس طرح ان احادیث کے درمیان کوئی اشکال اور تعارض باقی نہیں رہتا۔'' آگے مزید فرماتے ہیں کہ ''اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ کھڑے ہوکر پینا مکروہ کیوں کر ہوسکتا ہے، جب کہ بعض مواقع پر آپؐ نے کھڑے ہوکر پیا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپؐ نے ایسا بیانِ جواز کے لیے کیا تھا۔ اس لیے آپؐ کا کھڑے ہوکر پینا مکروہ نہ ہوگا، جب کہ دوسرے لوگوں کے لیے کھڑے ہوکر پینا مکروہ ہوگا۔ آپؐ سے ثابت ہے کہ آپؐ نے ایک مرتبہ وضو میں اعضاء کو ایک ایک بار دھویا اور ایک مرتبہ آپؐ نے سواری پر طواف کیا، جب کہ اس پر اجماع ہے کہ وضو میں اعضاء کو تین تین بار دھونا اور پیدل طواف کرنا افضل ہے۔ اس طرح کے نظائر بے شمار ہیں۔ آں حضرت ﷺ کبھی کبھی بیانِ جواز کے لیے کوئی کام ایک مرتبہ یا چند مرتبہ کرتے تھے، جب کہ افضل صورت پر پابندی سے عمل کرتے تھے۔ چناں چہ آپؐ نے اکثر وضو میں اعضاء کو تین تین بار دھویا ہے، اکثر طواف پیدل کیا ہے اور اکثر پانی بیٹھ کر پیا ہے۔ جس شخص کو علم سے ذرا سا بھی واسطہ ہو اسے اس امر میں کوئی شبہ نہ ہوگا۔''

(شرح صحیح مسلم، جلد: ۵، جز ۱۳، ص: ۱۹۵)

علامہ ابن قیمؒ نے بھی اس موضوع پر لکھا ہے۔ آں حضرت ﷺ کے پینے کے معمولات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''آں حضرت ﷺ اکثر بیٹھ کر پانی نوش فرمایا کرتے تھے، بلکہ آپؐ نے کھڑے ہوکر پینے سے سختی سے منع فرمایا ہے۔ بس ایک مرتبہ آپؐ نے کھڑے ہوکر پیا ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ آپؐ کے اس عمل نے آپؐ کی نہی کو منسوخ کر دیا۔ جب کہ بعض دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ آپؐ نے یہ واضح کرنے کے لیے ایسا کیا تھا کہ کھڑے ہوکر اور بیٹھ کر دونوں طرح

پینا جائز ہے۔ بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے (واللہ اعلم) کہ یہ ایک خاص واقعہ ہے، جس میں آپؐ نے کسی عذر کی بنا پر کھڑے ہوکر پیا تھا۔ واقعے کے سیاق سے اس پر دلالت ہوتی ہے۔ آپؐ زم زم کے کنویں پر تشریف لے گئے۔ وہاں لوگ پانی پلا رہے تھے۔ آپؐ نے ڈول لے کر اس سے کھڑے ہوکر پیا۔ اس مسئلے میں صحیح بات یہ ہے کہ کھڑے ہوکر پینا ممنوع ہے۔ البتہ اگر کوئی عذر ہو، جس سے آدمی بیٹھ نہ سکے تو کھڑے ہوکر پی سکتا ہے۔ اس طرح دونوں قسم کی احادیث میں تطبیق ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم۔'' (زادالمعاد، ۱/۱۴۹-۱۵۰)

اس تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ آبِ زم زم کھڑے ہوکر پینا مسنون نہیں ہے بلکہ اسے بھی بیٹھ کر پینا پسندیدہ ہے۔

شادی کی رسمیں

سوال: درج ذیل مسئلہ میں آپ سے قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب کی خواہش ہے۔

نکاح ایک مسنون عمل ہے۔ اس میں ہمارے سماج میں ان چیزوں پر عمل کیا جاتا ہے:

(۱) لڑکی کی شادی میں بہت زیادہ کھانا بنوانا اور دعوت کے وقت پلنگ تخت لے کر بیٹھ جانا، تاکہ دعوت میں آنے والے اپنا نام لکھوا کر روپے یا جہیز میں دیا جانے والا سامان لکھوائیں۔ بنا لکھوائے شاید ہی کوئی دعوت میں شرکت کرتا ہو۔ لڑکی کے نکاح میں اس طرح کا رواج غیر اسلامی نظر آتا ہے۔ مگر ارکان جماعت اسلامی بھی سماج کے طور طریقے کے مطابق ہی شادی کرتے ہیں۔ اسلام پسند نوجوانوں کو اعتراض ہے۔ ان کا اعتراض درست ہے؟ یا ارکان جماعت کا سماجی رسوم کو پورا کرنا صحیح ہے؟ جہیز دینا اور لینا کیسا ہے؟

(۲) لڑکے کی شادی میں بارات کا رواج ہے اور ارکان جماعت بھی اپنے بچوں کی شادی میں بارات لے جانے کا طریقہ اپناتے ہیں۔ البتہ گانے بجانے سے پرہیز کرتے ہیں۔ بارات کی دعوت اور بارات لے کر لڑکی کے گھر جانا، کھانا کھانا کیسا ہے؟

(۳) ولیمہ اور عقیقہ کی دعوت میں عام طور پر مردوں کو دعوت کم دی جاتی ہے اور عورتوں کو زیادہ مدعو کیا جاتا ہے، تاکہ سامان موقعے کی مناسبت سے خوب آئے۔

بہ راہ کرم مذکورہ بالا رسوم کے سلسلے میں قرآن وحدیث کی روشنی میں صحیح رہ نمائی فرمائیں۔

جواب: خطبۂ نکاح میں قرآن کریم کی جن آیات (النساء:۱، آل عمران:۱۰۲، الاحزاب:۷۰-۷۱) کی تلاوت کی جاتی ہے ان میں اِتَّقُوا اللّٰہَ (اللہ سے ڈرو) کی تکرار ہے۔ آیات کے اس انتخاب میں بڑی حکمت پائی جاتی ہے۔ نکاح خوشی کے ان مواقع میں سے ہے، جن میں عموماً اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بتائی ہوئی حدود کا پاس ولحاظ نہیں رکھا جاتا۔ جذبات، خواہشات، ارمان، بیوی بچوں کا اصرار، خاندان اور سماج کا دباؤ، خاندانی وجاہت اور برتر سماجی حیثیت کا اظہار، مال و دولت کی نمود ونمائش اور دیگر محرکات ہوتے ہیں، جن کی بنا پر آدمی نکاح کے موقعے پر خوب خرچ کرتا ہے اور دوسروں سے خرچ کرواتا ہے۔ اس کے پاس خاطر خواہ مال نہیں ہوتا تو دوسروں سے قرض لیتا ہے اور زندگی بھر اس سے گراں بار رہتا ہے۔

اسلام نکاح کو آسان تر اور بدکاری کو دشوار بنانا چاہتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے:

خَيْرُ النِّكَاحِ اَيْسَرُهٗ. (سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب فیمن تزوج ولم یسمّ صداقاً حتی مات، حدیث: ۲۱۱۷)

''بہترین نکاح وہ ہے، جو سب سے زیادہ آسانی سے انجام پائے۔''

ایک دوسری حدیث میں، جو ام المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے، آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

اِنَّ اَعْظَمَ النِّكَاحِ بَرَكَةً اَيْسَرُهٗ مُؤْنَةً. (مسند احمد، ۸۲/۶)

''سب سے بابرکت نکاح وہ ہے، جس میں کم سے کم خرچ ہو۔''

آپ نے جن رسوم کا تذکرہ کیا ہے ان کے علاوہ بھی بے شمار رسوم شادی کے موقعے پر انجام دی جاتی ہیں۔ ان میں سے بیش تر ہندوانہ تہذیب کی نقالی میں اختیار کر لی گئی ہیں۔ اسلامی تہذیب سے ان کا دور کا بھی تعلق نہیں ہے اور رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگیوں سے ان کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ مثال کے طور پر جہیز کو لیجیے۔ جہیز کے لمبے چوڑے مطالبے کیے جاتے ہیں۔ زبان سے نہ کیے جائیں تو بھی اس کی امید رکھی جاتی ہے اور سماج

کے دباؤ سے لڑکی والے بھی جہیز دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ سراسر ہندو تہذیب کا اثر ہے۔ ہندو مت میں وراثت میں لڑکی کا کوئی حصہ نہیں، اس لیے اس کی شادی کے موقع پر اسے کچھ دے دلا کر رخصت کر دیا جاتا ہے۔ اسلام میں شادی کے بعد گھر گرہستی کا سامان فراہم کرنا شوہر کی ذمہ داری ہے۔ بعض حضرات جہیز کے جواز میں یہ دلیل دیتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہؓ کو جہیز دیا تھا۔ جب کہ 'جہیز فاطمی' کی حقیقت یہ ہے کہ آں حضرت ﷺ کے داماد حضرت علیؓ، جو آپ کے چچازاد بھائی بھی تھے، بچپن سے آپ کی کفالت میں، آپ کے ساتھ رہتے تھے۔ حضرت فاطمہؓ سے شادی کے بعد ان کا الگ گھر بسانے کے لیے آپؐ نے انہی کی زرہ بازار میں فروخت کروا کے گھریلو ضروریات کی کچھ چیزیں منگوائی تھیں۔ اس طرح حضورؐ نے فاطمہؓ کے باپ کی حیثیت سے کوئی جہیز نہیں دیا بلکہ ہونے والے شوہر کی زرہ فروخت کرا کر گھر گرہستی کا سامان مہیا کرایا۔ لڑکے کی شادی میں بڑی تعداد میں باراتیوں کو لے جا کر لڑکی والوں کو زیر بار کیا جاتا ہے۔ بسا اوقات خود لڑکی والے نام ونمود کی خاطر بڑی بارات کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جب کہ مروجہ بارات کا صدرِ اول میں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ عہدِ نبوی میں بعض ایسی شادیاں بھی ہوئی ہیں، جن میں رسول اللہ ﷺ کے مدینہ منورہ میں رہتے ہوئے بھی آپؐ کو شریک کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی اور بعد میں آپؐ کو اس کا علم ہوا۔ ولیمہ کے نام پر بڑے بڑے جشن منائے جاتے ہیں، مگر اس میں آں حضرت ﷺ کی اس تنبیہ کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے:

شَرُّ الطَّعَامِ طَعَامُ الْوَلِيْمَةِ، يُدْعٰى لَهَا الْأَغْنِيَاءُ وَ يُتْرَكُ الْفُقَرَاءُ.

(صحيح بخاری، كتاب النكاح، باب من ترك الدعوة فقد عصى الله و رسوله، حديث: ۵۱۷۷، صحيح مسلم، كتاب النكاح، باب الأمر باجابة الداعى الى دعوة، حديث: ۱۴۳۲)

''سب سے برا کھانا اس ولیمہ کا کھانا ہے، جس کی دعوت صرف مال داروں کو دی جائے اور غریبوں کو اس میں نہ بلایا جائے۔''

تحریکِ اسلامی کے وابستگان، جو صحیح دینی شعور رکھتے ہیں، انھیں اس سلسلے میں مثالی نمونہ پیش کرنا چاہیے، لیکن افسوس کہ ان میں سے بہت سوں کا طرزِ عمل دوسرے مسلمانوں سے

مختلف نہیں ہے۔ وہ بھی تمام رسوم میں ملوث نظر آتے ہیں اور اس سلسلے میں ناقابل قبول اعذار پیش کرتے ہیں۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ عموماً رشتہ طے کرنے میں دین داری کو ترجیح نہیں دی جاتی، بلکہ اسے آخری نمبر پر رکھا جاتا ہے اور تحریک اسلامی کے وابستگان دوسروں پر اثر انداز نہیں ہو پاتے، بلکہ وہ گھر والوں، رشتہ داروں اور ہونے والے رشتہ داروں کی تجاویز، مشوروں اور مطالبات کو قبول کرنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔ لیکن تحریک اسلامی میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے، جنھوں نے اپنے بچوں کی شادیاں انتہائی سادگی سے، اسلامی تعلیمات کے مطابق کی ہیں۔

ان حالات میں قابل مبارک باد ہیں وہ نوجوان، جو نہ صرف صحیح اسلامی تعلیمات سے کماحقہ واقف ہیں، بلکہ بلاخوف لومۃ لائم ان پر عمل کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔ امید ہے کہ ان کی کوششیں رنگ لائیں گی اور اسلامی معاشرہ غیر اسلامی تہذیب کے اثرات سے پاک ہوگا۔

دلہن کے لیے پالکی کا استعمال

سوال: یہاں شادی بیاہ کے مواقع پر دلہن کو پالکی میں بٹھا کر محرم و نامحرم ہر کس و ناکس اٹھا کر دولہا کے گھر تک لے جاتے ہیں۔ یا پہاڑی راستے کو عبور کر کے روڈ پوائنٹ تک لے جاتے ہیں۔ ایسا کرنے میں کوئی شرعی ممانعت تو نہیں ہے؟ آں حضور ﷺ کے زمانے میں اس قسم کی کوئی مثال ملتی ہے یا نہیں؟ پہاڑی علاقوں میں بسا اوقات سخت نشیب یا چڑھائی پر دلہن کو لے جانا پڑتا ہے۔ اس سے اس کی پریشانی میں اضافہ ہوتا ہے۔ دلہن کو اپنے ماں باپ، بھائی بہن سے ایک قسم کی ہمیشہ کی جدائی کی فکر ہوتی ہے، مزید برآں سخت سفر کی دقت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اس پریشانی سے بچنے کے لیے پالکی کا استعمال اس کے لیے ایک بھروسہ و تسلی کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ برائے مہربانی تفصیل سے جواب دیجیے کہ کیا ایسے حالات میں پالکی کا استعمال جائز ہوگا؟

جواب: دلہن کو پالکی میں بٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جاسکتا ہے۔ پالکی اٹھانے والوں کا محرم ہونا ضروری نہیں ہے۔ بس پردہ کے آداب ملحوظ رہیں اور کسی فتنہ کا اندیشہ نہ ہو۔ 'حدیث الافک' سے اس سلسلے میں رہ نمائی ملتی ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ غزوۂ مریسیع میں اسلامی لشکر میں آں حضرت ﷺ کے ساتھ تھیں۔ انھیں ہودج میں بٹھا کر اونٹ پر سوار کرایا جاتا

تھا اور قافلہ رکنے پر ہودج اونٹ سے اتار دیا جاتا تھا۔ (صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث الافک، حدیث: ۴۱۴۱، صحیح مسلم، کتاب التوبۃ، باب فی حدیث الافک، حدیث: ۲۷۷۰)، جو لوگ اس خدمت پر مامور تھے ان کے بارے میں کوئی صراحت نہیں ملتی کہ وہ حضرت عائشہؓ کے محارم میں سے تھے۔

بدلے کی شادی

سوال: ہمارے ملک کے بعض حصوں میں بدلے کی شادیوں کا رواج ہے۔ ایک سوال کے جواب میں مولانا مودودیؒ نے رسائل ومسائل جلد دوم میں لکھا ہے کہ ''عام طور پر ادلے بدلے کے نکاح کا، جو طریقہ ہمارے ملک میں رائج ہے وہ دراصل اسی شغار کی تعریف میں آتا ہے، جس سے نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے۔'' مولانا مودودیؒ نے شغار کی تین صورتیں بتائی ہیں: ایک یہ کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو اس شرط پر اپنا لڑکا دے کہ وہ اس کے بدلے میں اپنی لڑکی دے گا اور ان میں سے ہر ایک لڑکی دوسری لڑکی کا مہر قرار پائے۔

دوسرے یہ کہ شرط تو وہی ادلے بدلے کی ہو، مگر دونوں کے برابر برابر مہر (مثلاً ۵۰، ۵۰ ہزار روپیہ) مقرر کیے جائیں اور محض فرضی طور پر فریقین میں ان مساوی رقموں کا تبادلہ کیا جائے، دونوں لڑکیوں کو عملاً ایک پیسہ بھی نہ ملے۔

تیسرے یہ کہ ادلے بدلے کا معاملہ فریقین میں صرف زبانی طور پر ہی طے نہ ہو، بلکہ ایک لڑکی کے نکاح میں دوسری لڑکی کا نکاح شرط کے طور پر شامل ہو۔

آگے مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے کہ ''پہلی صورت کے ناجائز ہونے پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔ البتہ باقی دو صورتوں کے معاملے میں اختلاف واقع ہوا ہے۔'' انھوں نے فقہاء کے اختلاف کی تفصیل نہیں دی ہے۔ البتہ خود ان کے نزدیک تینوں صورتیں خلاف شریعت ہیں۔ بہ راہِ کرم موخر الذکر دونوں صورتوں میں اختلافِ فقہاء کی کچھ تفصیل فراہم کردیں۔

جواب: صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے:

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنِ الشِّغَارِ. (صحیح بخاری، کتاب النکاح،

باب الشغار، حدیث: ۵۱۱۲، صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب تحریم نکاح الشغار و بطلانه، حدیث: ۱٤۱۵)

''رسول اللہ ﷺ نے نکاح شغار سے منع فرمایا ہے۔''

اسی روایت میں آگے نکاح شغار کی تعریف بھی بیان کی گئی ہے۔''شغار یہ ہے کہ ایک شخص اپنی بیٹی کا نکاح دوسرے شخص سے اس شرط پر کردے کہ دوسرا اپنی بیٹی کا نکاح اس سے کردے اور دونوں لڑکیوں کا کوئی مہر طے نہ ہوا ہو۔'' دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تعریف حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے شاگرد حضرت نافعؒ نے کی تھی۔ ان کے شاگرد نے ان سے پوچھا کہ حضرت! شغار کیا ہے؟ تو انھوں نے یہ وضاحت کی۔

(صحیح بخاری، کتاب الحیل، باب الحیلة فی النکاح، حدیث: ٦٩٦٠)

ایک حدیث حضرت عمران بن حصینؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لاَ شِغَارَ فِی الْاِسْلاَمِ. (جامع ترمذی، ابواب النکاح، باب ماجاء فی النهی عن نکاح الشغار، حدیث: ۱۱۲۳، صحّحه الالبانی)

''اسلام میں شغار کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔''

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں:''اس مضمون کی حدیث حضرات صحابہ: انس، ابو ریحانہ، ابن عمر، جابر، معاویہ، ابو ہریرہ اور وائل بن حجر رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔

مذکورہ احادیث کی بنیاد پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ نکاح شغار جائز نہیں ہے۔ البتہ ان کے درمیان اس میں اختلاف ہے کہ اگر ایسا نکاح ہو جائے تو کیا مہر مثل لازم کرنے سے وہ درست ہو جائے گا؟ ائمۂ ثلاثہ (امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ) فرماتے ہیں کہ مہر مثل لازم کرنے کے باوجود وہ درست نہ ہوگا۔ دلیل میں وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ اور حضرت زیدؓ نے ایسے نکاح میں تفریق کرادی تھی۔

اگر بدلے کی شادی کے ساتھ دونوں لڑکیوں کا مہر طے کر دیا جائے تو امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک نکاح صحیح ہوگا۔ امام مالکؒ کے نزدیک اگر ایک لڑکی کا نکاح دوسری لڑکی کے نکاح

کے ساتھ مشروط نہ ہو تو دونوں کا مہر طے ہونے کی صورت میں ان کا نکاح صحیح ہوگا۔ حنبلی فقیہ امام خرقیؒ کے نزدیک اس صورت میں بھی نکاح صحیح نہ ہوگا۔ دلیل میں وہ سنن ابی داؤد کی ایک روایت پیش کرتے ہیں، جس میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے صاحب زادے عباس نے اپنی بیٹی کا نکاح عبدالرحمٰن بن حکم سے اور عبدالرحمٰن نے اپنی بیٹی کا نکاح عباس سے کر دیا تھا۔ دونوں لڑکیوں کا مہر بھی طے ہوا تھا، لیکن حضرت معاویہؓ نے حضرت مروان کو حکم دیا کہ دونوں نکاحوں میں تفریق کرا دی جائے، کیوں کہ یہ نکاح شغار ہے، جس سے نبی ﷺ نے منع کیا ہے۔

(کتاب النکاح، باب فی الشغار، حدیث: ۲۰۷۵، حسّنه الالبانی)

تابعین میں حضرات عطا، عمرو بن دینار، مکحول، زہری اور ثوری رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ نکاح شغار، جس کی ممانعت حدیث میں آئی ہے، یہ ہے کہ بدلے کی شادی میں کسی لڑکی کا مہر طے نہ کیا جائے۔ لیکن اگر مہر مثل لازم کر دیا جائے تو یہ نکاح صحیح ہوگا۔ حنفیہ کے نزدیک بھی یہ نکاح صحیح ہے اور دونوں لڑکیوں کو مہر مثل ملے گا۔

مولانا مودودیؒ نے نکاح شغار کی، جو تین صورتیں بتائی ہیں ان میں پہلی اور تیسری صورت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دراصل مالکیہ نے نکاح شغار کی تین قسمیں کی ہیں:

اول: وہ بدلے کا نکاح، جس میں کسی لڑکی کا مہر طے نہ ہوا ہو، اسے شغار صریح کہتے ہیں۔

دوم: وہ بدلے کا نکاح، جس میں دونوں لڑکیوں کا مہر طے ہو، لیکن ایک لڑکی کا نکاح دوسری لڑکی کے نکاح کے ساتھ مشروط ہو، اسے وجہ شغار کہتے ہیں۔

سوم: اول اور دوم کی مرکب صورت، یعنی ایک لڑکی کا مہر طے ہو اور دوسری کا نکاح بغیر مہر کے ہو۔

شغار کی پہلی صورت مالکیہ کے نزدیک باطل ہے۔ ایسا نکاح فسخ کر دیا جائے گا، خواہ خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ خلوت نہ ہوئی ہو تو ان لڑکیوں کو کچھ نہ ملے گا۔ خلوت ہو چکی ہو تو وہ مہر مثل کی مستحق ہوں گی۔ دوسری صورت بھی باطل ہے، لیکن اس میں نکاح اس وقت فسخ ہوگا جب خلوت نہ ہوئی ہو۔ خلوت ہو چکی ہو تو عقد ہو جائے گا اور وہ لڑکیاں طے شدہ مہر اور مہر مثل میں سے،

جو زیادہ ہو اس کی مستحق ہوں گی۔ البتہ اس دوسری صورت میں اگر ایک لڑکی کا نکاح دوسری لڑکی کے ساتھ مشروط نہ ہو تو ایسا نکاح صحیح ہوگا۔ تیسری صورت میں، جس لڑکی کا مہر طے ہوا ہو اس سے اگر خلوت نہیں ہوئی ہے تو نکاح فسخ کر دیا جائے گا۔ خلوت ہو چکی ہے تو نکاح باقی رہے گا اور وہ طے شدہ مہر اور مہر مثل میں سے جو زیادہ ہو اس کی مستحق ہوگی اور جس لڑکی کا مہر طے نہ ہوا ہو اس کا نکاح بہ ہر حال فسخ ہوگا، خواہ خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ خلوت ہو چکی ہو تو وہ مہر مثل کی مستحق ہوگی۔ (الفقه على المذاهب الاربعة، ١٢٦/٤)

عورت کا حقِ مہر

سوال: ایک پیچیدہ مسئلہ درپیش ہے۔ بہ راہِ کرم شریعت کی روشنی میں جواب سے نوازیں۔ ہمارے یہاں ۱۹۸۴ میں ایک نکاح ہوا تھا۔ اس وقت لڑکے کے والد کی اجازت سے سڑک کی ایک کنال زمین (ایک بیگھے کا چوتھائی حصہ) اور ایک عدد اخروٹ کا درخت لڑکی کا مہر مقرر ہوا تھا۔ آج تقریباً بائیس سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد کسی گھریلو جھگڑے کی وجہ سے لڑکی کا حصہ ہڑپ کیا جا رہا ہے۔ لڑکے کا باپ کہتا ہے کہ میرا لڑکا اپنے طور سے اپنی بیوی کا مہر ادا کرے اور میری زمین اور اخروٹ کا درخت مجھے واپس کر دے۔ ہاں، میرے مرنے کے بعد میری وراثت میں سے اس کے حصہ میں جو جائیداد آئے اس میں سے وہ ایک کنال زمین اور اخروٹ کا درخت اپنی بیوی کو دے سکتا ہے۔ اس لڑکے کا ایک چھوٹا بھائی ہے وہ یہ اعتراض کرتا ہے کہ میرے بڑے بھائی کی طرف سے، جو مہر اس کی بیوی کو دیا گیا ہے وہ میری بیوی کے مہر کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے۔ کیوں کہ آج کل ایک کنال زمین کی قیمت چار لاکھ روپے سے بھی تجاوز کر چکی ہے اور اس پر مستزاد کئی ہزار کی قیمت کا اخروٹ کا درخت بھی ہے۔ اس لیے یہ بڑی ناانصافی ہوگی کہ میرے بڑے بھائی کی بیوی کو زیادہ مہر مل جائے اور میری بیوی کو کم مہر ملے۔

جواب: عورت کے مہر کی ادائی کے سلسلے میں ہمارے سماج میں بڑی غفلت اور بے توجہی پائی جاتی ہے۔ مہر طے تو کر دیا جاتا ہے، لیکن اسے ادا نہیں کیا جاتا۔ بعض لوگ اس کا بہت معمولی سا حصہ (مہر معجّل کے طور پر) فوراً ادا کر دیتے ہیں، لیکن بقیہ حصہ مہر مؤجل کے طور پر طے کرا لیتے ہیں،

جس کی ادائی کی کبھی کوشش نہیں کی جاتی۔ عورتوں میں بھی اپنے اس حق کے سلسلے میں بیداری نہیں پائی جاتی۔ ان کی جانب سے اس کا مطالبہ تو دور کی بات، وہ سمجھتی ہیں کہ مہر لے لینے کی صورت میں رشتے میں کم زوری اور شوہر کی جانب سے تعلقِ خاطر میں کمی آجاتی ہے۔ اس سلسلے میں اسلام کا صحیح نقطۂ نظر واضح کرنے کی ضرورت ہے۔

قرآن کریم میں مہر کی ادائی پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ (النساء:۲۴)

''پھر جو ازدواجی زندگی کا لطف تم ان سے اٹھاؤ اس کے بدلے ان کے مہر بہ طور فرض کے ادا کرو۔''

اگلی آیت میں ہے:

فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَ اٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ

(النساء:۲۵)

''ان کے سرپرستوں کی اجازت سے ان کے ساتھ نکاح کرلو اور معروف طریقہ سے ان کے مہر ادا کردو۔''

قرآن نے تاکید کی ہے کہ عورتوں کے مہر خوشی خوشی ادا کیے جائیں اور انھیں ہڑپ لینے کی کوشش نہ کی جائے:

وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ (النساء:۴)

''اور عورتوں کے مہر خوش دلی کے ساتھ (فرض جانتے ہوئے) ادا کرو۔''

وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ (النساء:۱۹)

''اور نہ تمھارے لیے یہ حلال ہے کہ عورتوں کو تنگ کرکے اس مہر کا کچھ حصہ اڑا لینے کی کوشش کرو، جو تم انھیں دے چکے ہو۔''

زیر بحث مسئلے میں چند وضاحتیں درج ذیل ہیں:

۱- مہر عورت کا حق ہے اور اسے اس میں تصرف کرنے کی پوری آزادی ہے۔ وہ پورا مہر وصول کر سکتی ہے، اس میں سے کم بھی لے سکتی ہے اور پورا معاف بھی کر سکتی ہے۔ اگر وہ اپنی خوشی سے اس میں سے شوہر کو کچھ دے دے تو وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، لیکن کسی طرح دباؤ ڈال کر اس سے مہر معاف نہیں کروایا جا سکتا۔ قرآن کہتا ہے:

فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا ○

(النساء:۴)

''البتہ اگر وہ خود اپنی خوشی سے مہر کا کوئی حصہ تمھیں معاف کر دیں تو اسے تم مزے سے کھا سکتے ہو۔''

۲- مہر کی ادائی شوہر کے ذمے ہے۔ احادیث میں کثرت سے ایسے واقعات مروی ہیں کہ نکاح سے قبل اللہ کے رسول ﷺ نے شوہر سے دریافت کیا کہ اس کے پاس مہر ادا کرنے کے لیے کیا ہے؟ اس کی وضاحت پر آپؐ نے اس چیز کو عورت کا مہر قرار دیا اور شوہر کو اس کی ادائی کا پابند کیا۔ حضرت علیؓ نے جب حضرت فاطمہؓ سے نکاح کی درخواست آں حضرت ﷺ کے سامنے کی تو آپؐ نے فرمایا: تمھارے پاس مہر میں دینے کے لیے کیا ہے؟ انھوں نے ایک زرہ کا تذکرہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا: اسے ہی دے دو۔

(سنن نسائی، کتاب النکاح، باب تحلّة الخلوة حدیث : ۳۳۷۵، ۳۳۷۶)

۳- مہر شوہر کی طرف سے کوئی دوسرا بھی ادا کر سکتا ہے، خواہ وہ شوہر کا باپ ہو یا کوئی اور۔ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت ام حبیبہؓ کو نکاح کا پیغام دیا تو نجاشی شاہِ حبشہ نے آپؐ کی جانب سے چار ہزار درہم بہ طور مہر انھیں ادا کیے تھے۔ (سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب الصداق، حدیث: ۲۱۰۷، سنن النسائی، کتاب النکاح، باب القسط فی الاصدقة، حدیث: ۳۳۵۰)

۴- ایک خاندان کی دو لڑکیوں کا مہر الگ الگ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ایک خاندان میں آنے والی دو بہوؤں کا مہر بھی الگ الگ ہو سکتا ہے۔ مہر کی تعیین دراصل فریقین کی رضامندی سے ہوتی ہے۔ اوپر گزرا کہ ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ کا مہر چار ہزار درہم تھا، جب کہ

آں حضرت ﷺ کی دیگر ازواج مطہرات کا مہر چار سو درہم تھا۔ (سنن النسائی، حوالہ سابق)

مذکورہ بالا تنقیحات کی روشنی میں دریافت کردہ مسئلہ کا جواب یہ ہے:

۱- صورتِ مسئلہ یہ معلوم ہو رہی ہے کہ لڑکے کے باپ نے طے شدہ مہر (ایک کنال زمین اور ایک اخروٹ کا درخت) اپنے لڑکے کی طرف سے اپنی بہو کو دے دیا تھا۔ اب کسی وجہ سے بائیس سال کے بعد وہ اسے واپس مانگ رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ میرا دیا ہوا مال واپس کر دیا جائے اور لڑکا مہر اپنی طرف سے ادا کرے۔ ایسا کرنا صحیح نہیں ہے۔ قرآن میں ہے:

وَّ اٰتَیۡتُمۡ اِحۡدٰىهُنَّ قِنۡطَارًا فَلَا تَاۡخُذُوۡا مِنۡهُ شَیۡـًٔا ؕ (النساء:۲۰)

''اور خواہ تم نے اسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو، اس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔''

۲- چھوٹے بھائی کا اعتراض درست نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کے ذہن میں یہ بات ہے کہ دونوں عورتوں کا مہر برابر ہونا چاہیے اور مہر کی ادائی باپ کے ذمے ہے۔ حالاں کہ دونوں باتیں صحیح نہیں۔ مہر کم طے ہونے پر جب لڑکی اور اس کے گھر والوں نے اعتراض نہیں کیا اور طے شدہ مہر پر نکاح کی رضامندی ظاہر کر دی تو اسے اعتراض کرنے کا کیا حق ہے اور مہر کی ادائی تو خود اس کے ذمے ہے۔ اگر وہ سمجھتا ہے کہ اس کی بیوی کو کم مہر ملا ہے تو وہ اپنی طرف سے جتنا چاہے اضافہ کر سکتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَلَا جُنَاحَ عَلَیۡكُمۡ فِیۡمَا تَرٰضَیۡتُمۡ بِهٖ مِنۡۢ بَعۡدِ الۡفَرِیۡضَةِ

(النساء:۲۴)

''البتہ مہر کی قرارداد ہو جانے کے بعد آپس کی رضامندی سے تمھارے درمیان اگر کوئی سمجھوتہ ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔''

اللہ کے رسول ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرنے اور ان کے حقوق کی پامالی سے بچنے کی تاکید فرمائی تھی۔ (سنن ابی داؤد، کتاب المناسك، باب صفة حجة الوداع، حدیث: ۱۹۰۵) ہمیں اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ اگر ہم نے اس دنیا میں ان کا کوئی حق غصب کر لیا تو قیامت کے دن بارگاہِ الٰہی میں ہمیں پائی پائی کا حساب دینا ہوگا۔

سوال: آج کل لوگ اسے فخر سمجھتے ہیں کہ جتنا زیادہ ہو سکے مہر مقرر کریں۔ چناں چہ بعض حضرات پچاس ہزار یا ایک لاکھ روپے تک تحریر کر دیتے ہیں، مگر ادائی دس پندرہ ہزار ہوتی ہے۔ باقی غیر معجّل رکھ لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر خدانخواستہ میاں بیوی میں نا اتفاقی پیدا ہو تو اس صورت میں شوہر کو تحریر کردہ حقِ مہر ادا کرنا ہوگا۔ کیا شریعت میں اس کی کوئی گنجائش ہے؟

جواب: شریعت نے مہر کی کوئی مقدار متعین نہیں کی ہے۔ اسے زوجین اور ان کے خاندانوں کے حالات اور باہمی رضامندی پر چھوڑ دیا ہے۔ عہد نبویؐ کے بہت سے واقعات سے اشارہ ملتا ہے کہ مہر کا کم رکھنا اور نکاح کو آسان بنانا پسندیدہ ہے۔ حضرت عمر بن الخطابؓ نے ایک مرتبہ لوگوں کے درمیان خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: ''لوگو! عورتوں کے مہر بہت زیادہ نہ رکھو، اگر مہر زیادہ رکھنا فخر کی بات ہوتی تو نبی ﷺ ایسا ضرور کرتے، لیکن آپ ﷺ نے اپنی ازواج اور اپنی بیٹیوں میں سے کسی کا مہر بارہ اوقیہ سے زیادہ نہیں رکھا۔''

(سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب الصداق، حدیث: ۲۱۰۶، جامع ترمذی، ابواب النکاح، باب ماجاء فی مهور النساء، حدیث: ۱۱۱٤)

لیکن جو کچھ مہر طے کیا جائے وہ عورت کا حق اور اس کی ملکیت ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے ایک خاص حد سے زیادہ مہر مقرر کرنے کی ممانعت کرنے پر ایک عورت نے انھیں ٹوکا کہ جب اللہ تعالیٰ نے مہر کے سلسلے میں کوئی حد بندی نہیں کی ہے تو آپ کون ہوتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَ اٰتَیۡتُمۡ اِحۡدٰىهُنَّ قِنۡطَارًا (النساء:۲۰)

''اور تم نے اسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو۔''

حضرت عمرؓ نے اپنی بات سے رجوع کیا اور فرمایا: ''عورت کی بات صحیح ہے، عمر نے غلطی کی۔'' (تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر، ۱/۶۱۰)

اس لیے جو کچھ مہر طے کیا جائے وہ ادا کرنے کی نیت سے طے کیا جائے اور اسے فوراً ادا کر دیا جائے یا جلد از جلد مکمل ادائی کی کوشش کی جائے۔

بیوی کا حقِ سُکنیٰ

سوال: کیا بیوی اپنے شوہر سے، اس کے گھر والوں سے الگ، گھر لینے کا مطالبہ کر سکتی ہے؟ کیا شرعاً ایسا کرنا صحیح ہے؟

جواب: شادی کے بعد شوہر پر بیوی کے تعلق سے جو ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ رہائش کے لیے گھر فراہم کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ط (الطلاق:۶)

''ان کو اسی جگہ رکھو جہاں تم رہتے ہو، جیسی کچھ بھی جگہ تمھیں میسر ہو اور انھیں تنگ کرنے کے لیے ان کو نہ ستاؤ۔''

یہ گھر ایسا ہونا چاہیے جہاں بیوی کو پوری آزادی حاصل ہو، وہ اپنے مال و اسباب کے سلسلے میں بے فکر ہو اور شوہر کے ساتھ بے تکلف رہ سکے۔ اگر آدمی صاحبِ حیثیت ہو اور اس کے حالات اجازت دیتے ہوں تو اسے بیوی کے لیے علیٰحدہ مکان فراہم کرنا چاہیے۔ عورت شوہر سے اس کا مطالبہ کر سکتی ہے اور اگر حالات سازگار نہ ہوں تو بڑے مکان کے ایک حصے کو عورت کے لیے خاص کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ بیوی کا تعلق اصلاً شوہر سے ہوتا ہے۔ سسرال کے لوگوں کی خدمت بیوی کی ذمے داری نہیں ہے۔

یہ تو مسئلے کا قانونی پہلو ہے۔ اخلاقی اعتبار سے بیوی کو چاہیے کہ شوہر کے رشتے داروں کا خیال رکھے، ان کے ساتھ احترام اور محبت سے پیش آئے اور شوہر کے رشتے داروں کو بھی چاہیے کہ اس کی بیوی کے ساتھ اپنائیت کا مظاہرہ کریں، تبھی باہمی تعلقات خوش گوار رہ سکتے ہیں۔

ایسا مشترکہ خاندانی نظام، جس میں بیوی بری طرح جکڑی ہوئی ہو، اسے شوہر کے ساتھ بے تکلف رہنے کی مطلق آزادی نہ ہو اور سسرال میں اس کی حیثیت بے زبان خدمت گزار کی ہو، اسلام کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے۔

بیوی کی کمائی میں شوہر کا حق

سوال: کچھ لوگ عورتوں کی ملازمت کے بارے میں اعتراض کرتے ہیں کہ جو رقم تنخواہ کے طور پر عورت حاصل کرتی ہے وہ مرد پر حرام ہے۔ بہ راہ کرم اس بارے میں وضاحت فرمائیں؟

جواب: عورت کا اصل میدان کار اور اس کا فرض منصبی، شوہر کی خدمت، گھر کی نگرانی اور بچوں کی پرورش ہے۔ حدیث میں ہے:

وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلٰى اَهْلِ بَيْتِ زَوْجِهَا وَ وَلَدِهٖ وَ هِيَ مَسْئُوْلَةٌ عَنْهُمْ. (صحیح بخاری، کتاب الاحکام، باب قول اللّٰہ تعالٰی اطیعوا اللّٰہ و اطیعوا الرسول، حدیث: ۷۱۳۸، ودیگر مقامات، صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضیلۃ الامیر العادل حدیث: ۱۸۲۹)

''عورت اپنے شوہر کے گھر والوں اور اس کے بچوں کی نگراں ہے اور اس سے ان کے بارے میں پوچھا جائے گا۔''

اس کو متاثر کیے اور نقصان پہنچائے بغیر وہ ملازمت کر سکتی ہے، البتہ مشاہرہ کی شکل میں، جو رقم اسے حاصل ہوگی اس کی وہ مالک ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (النساء:۳۲)

''جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے۔''

مرد کا محض شوہر ہونا اس کو عورت کی آمدنی کا مستحق نہیں بنا دیتا۔ البتہ بیوی اپنی مرضی اور خوشی سے اپنی آمدنی کا، جو حصہ چاہے، شوہر کو دے سکتی ہے۔ ارشاد باری ہے:

وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا ۝ (النساء:۴)

''اور عورتوں کے مہر خوش دلی کے ساتھ ادا کرو، البتہ اگر وہ خود اپنی خوشی سے مہر کا کوئی حصہ تمھیں معاف کر دے تو اسے تم مزے سے کھا سکتے ہو۔''

اس آیت کی رو سے مہر عورت کا حق اور اس کی ملکیت ہے۔ پورا مہر یا اس کا کچھ حصہ عورت اپنی خوشی سے معاف کر دے یا لینے کے بعد شوہر کو وقت ضرورت واپس کر دے تو شوہر اسے اپنے کام میں لا سکتا ہے۔ یہی حکم عورت کو دیگر ذرائع سے حاصل ہونے والی رقموں کا ہوگا۔ لیکن عورت کی مرضی کے خلاف محض زور زبردستی اور دھمکی سے اس کی آمدنی پر قبضہ کر لینا شوہر کے لیے جائز نہ ہوگا۔

نکاح میں دھوکہ

سوال: ایک اہم مسئلہ درپیش ہے۔ گزارش ہے کہ اس سلسلے میں صحیح رہ نمائی فرمائیں۔ ایک صاحب کی شادی کو تین ماہ سے کچھ زائد ہوئے ہیں۔ شادی کے بعد لڑکی ایک دن سسرال میں گزار کر میکے چلی گئی۔ وہاں سے ٹھیک پندرہ دن بعد جب وہ دوبارہ سسرال آئی تو اس کے طرزِ عمل سے معلوم ہوا کہ اس کی دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے اور وہ نفسیاتی مریضہ ہے۔ اس صورت حال میں کیا کیا جائے؟

(الف) کیا یہ رشتہ باقی رہنے دیا جائے؟ جب کہ لڑکی کی دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے اور لڑکا نارمل ہے۔

(ب) اگر طلاق کی نوبت آجائے تو کیا لڑکی کو صرف مہر کے ساتھ رخصت کیا جائے؟ یا مہر کے ساتھ دوسری چیزیں (جیسے جائیداد، مکان وغیرہ) بھی واپس کر دی جائیں؟

(ج) لڑکی والوں کی طرف سے دھوکہ دیا گیا ہے۔ یعنی انھوں نے اس بات کو قطعی صیغۂ راز میں رکھا کہ لڑکی ابنارمل (Abnormal) ہے۔ ایسی صورت میں کیا پنچایت کے ذریعے ان پر تاوان (Penalty) عائد کیا جا سکتا ہے؟

آپ سے استدعا ہے کہ مذکورہ سوالات کے جوابات کتاب وسنت کی روشنی میں عنایت فرمائیں۔

جواب: نکاح کا رشتہ باہم الفت ومحبت اور اعتماد کی بنیادوں پر استوار کیا جانا چاہیے۔ اس کے ذریعے دو انسان، جو بسا اوقات ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوتے ہیں، ملتے ہیں اور ایک دوسرے کی رفاقت میں زندگی گزارنے کا عہد کرتے ہیں۔ نیز ان کے ذریعے دو خاندانوں میں قریبی تعلقات پیدا ہوتے ہیں، اس لیے اس کی استواری میں دھوکہ دہی سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنِّي. (صحيح مسلم، كتاب الايمان:۱۰۲)

''جس شخص نے دھوکہ دیا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔''

اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ ایک موقعے پر اللہ کے رسول ﷺ بازار میں نکلے۔ راستے میں ایک شخص غلّہ کا ایک ڈھیر لگائے بیچ رہا تھا۔ آپؐ نے اس ڈھیر کے اندر اپنا ہاتھ ڈالا تو کچھ نمی محسوس ہوئی۔ آپؐ نے فرمایا: یہ کیا؟ غلّہ کے مالک نے بتایا کہ بارش میں کچھ غلّہ بھیگ گیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا: تم نے اسے اوپر کیوں نہیں رہنے دیا کہ لوگوں کی نظر میں ہوتا۔ پھر آپؐ نے وہ بات فرمائی، جسے اوپر نقل کیا گیا ہے۔

امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں: ''جب نبی ﷺ نے سامان فروخت کرنے والے پر اپنے سامان کا عیب چھپانا حرام قرار دیا ہے تو نکاح کے معاملے میں عیب چھپانا کیوں کر جائز ہوسکتا ہے۔ (زادالمعاد، ۵/۱۸۵)

دوسری جانب یہ بھی ضروری ہے کہ نکاح طے کرنے سے قبل دونوں فریق ممکن حد تک تحقیقات کرلیں۔ بسا اوقات جلد بازی، جذبات، بے جا اعتماد یا دیگر اسباب سے مکمل تحقیقات کے بغیر رشتہ کرلیا جاتا ہے، بعد میں ایسی چیزیں سامنے آتی ہیں جن کی بنا پر رشتوں میں کشیدگی، تلخی اور تنازعہ پیدا ہوجاتا ہے جو بسا اوقات علیحدگی پر منتج ہوتا ہے۔ جب ہم زندگی کے ہر معاملے میں احتیاط، چھان پھٹک اور تحقیق کو ملحوظ رکھتے ہیں تو نکاح کی پائیداری اور استحکام کے مقصد سے اس معاملے میں بھی ضرور اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اللہ کے رسول ﷺ کے ارشاد سے ہمیں اس سلسلے میں رہ نمائی ملتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

تَخَيَّرُوْا لِنُطَفِكُمْ. (سنن ابن ماجه، ابواب النكاح، باب الأكفاء حديث: ١٩٦٨، حسّنه الألباني)

''اپنے نکاح کے لیے اچھے سے اچھا رشتہ تلاش کرو۔''

اس تفصیل کی روشنی میں مذکورہ سوالوں کے جوابات درج ذیل ہیں:

(۱) اگر نکاح ہوجانے کے بعد انکشاف ہو کہ زوجین میں سے کسی میں کوئی ایسا عیب ہے، جس سے دوسرا فریق ناگواری محسوس کرتا ہے تو نکاح کو فسخ کیا جاسکتا ہے۔ فقہاء نے تفصیل سے ان عیوب کا تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے جنون، جذام اور برص کو ان مشترکہ عیوب میں شمار کیا ہے، جو زوجین میں سے کسی میں پائے جائیں تو ان کی بنیاد پر دوسرا فریق فسخِ نکاح کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں: ''جس عورت کا نکاح ہو اور اسے برص، جنون یا جذام وغیرہ ہو، اس کے شوہر کو اختیار ہے، چاہے اس نکاح کو باقی رکھے، چاہے اسے طلاق دے دے۔''

(سنن بیہقی، ۷/ ۲۱۵، مصنف عبدالرزاق: ۱۰۶۷۷)

(۲) نکاح ہوجانے کے بعد اگر خلوت ہوگئی ہے تو عورت مہر کی مستحق ہے۔ حضرت علیؓ کے مذکورہ بالا فتویٰ میں آگے ہے: ''اگر خلوت ہوگئی ہے تو عورت کو مہر ملے گا۔'' خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا ہے: ''جس عورت کو جنون، جذام یا برص ہو اور اس کا رشتہ دھوکے سے کسی مرد سے کردیا جائے اور خلوت ہوجائے تو عورت مہر کی مستحق ہوگی اور مہر کی رقم اس کے ذمّے ہوگی، جس نے دھوکہ دیا ہے۔'' (موطا امام مالک، کتاب النکاح، باب ماجاء فی الصداق والحباء، ۲۲۶۸، مصنف عبدالرزاق، ۱۰۶۷۹، سنن بیہقی، ۷/ ۲۱۴) اگر عورت اپنے ساتھ اپنے مائیکے سے جائیداد، مکان اور دوسری چیزیں لائی ہے تو طلاق کی صورت میں ان تمام چیزوں کو واپس کردینا چاہیے۔

(۳) علیحدگی کی صورت میں لڑکی والوں کی طرف سے تاوان وصول کرنے کی تدبیر کرنا مناسب نہیں ہے۔ رشتے کی ناپائیداری کی ذمے داری دھوکہ کھانے والے پر بھی عائد ہوتی ہے کہ کیوں نہیں اس نے پہلے تمام تحقیقات کیں۔

یہ تو اس مسئلے کا فقہی اور قانونی پہلو ہوا۔ اس پر انسانی پہلو سے بھی غور کرنا چاہیے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نکاح کے وقت زوجین صحیح سالم ہوں۔ بعد میں ان میں سے کوئی کسی بیماری کا

شکار ہو جائے یا اس میں کوئی عیب پیدا ہو جائے۔ ایسی صورت میں فوراً طلاق اور علیحدگی کے بارے میں سوچنے سے قبل علاج معالجہ کرانے اور رشتے کو باقی رکھنے کی ہر ممکن تدبیر اختیار کرنی چاہیے۔

زوجین کے درمیان بے اعتمادی اور ناموافقت کا حل

سوال: ایک نجی مسئلہ میں شرعی رہ نمائی کی غرض سے رجوع کر رہا ہوں۔ میرے دن نہایت کرب میں گزر رہے ہیں، اس لیے درخواست ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو، مجھے رہ نمائی سے نوازیں۔ میری شادی کو کچھ ہی عرصہ ہوا ہے، جس سے ایک اولاد ہے۔ میری بیوی پہلے کسی اور سے محبت کرتی تھی، مگر شادی مجھ سے ہوگئی۔ اس نے اپنے سابقہ تعلقات کو مجھ سے چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ شروع ہی سے وہ میرے سامنے اس شخص کی مبالغہ آمیز تعریف اور اس سے تعلقِ خاطر کا اظہار کرتی رہی ہے۔ بیوی کی ذاتی کتابوں اور ڈائریوں میں میں نے مخصوص انداز میں مذکورہ شخص کا نام، پتہ اور فون نمبر وغیرہ لکھا ہوا پایا ہے۔ مزید برآں دورانِ سفر اس سے ایسی حرکتوں کا صدور ہوتا ہے (جیسے اجنبی مردوں سے نظریں ملانا، ان سے بلاتکلف باتیں کرنا وغیرہ) جو مجھے قطعاً پسند نہیں ہیں۔ ان حالات میں میری نظر میں بیوی کا کردار مشکوک ہو گیا ہے۔ میں سخت ذہنی الجھن اور پریشانی میں ہوں۔ میری زندگی میرے لیے بوجھ اور مصیبت بنی ہوئی ہے۔ کیا میں بیوی کے بارے میں شک کرنے میں حق بہ جانب ہوں؟ کیا ایسی صورت میں میرے لیے طلاق دینا جائز ہے؟ اگر طلاق دوں تو اس کی وجہ کیا بتاؤں؟ طلاق کی صورت میں غیر شرعی عدالت کے ذریعے مجھ سے ناروا مطالبات (مال جائیداد وغیرہ) کیے جائیں گے۔ کیا آخرت میں مجھے ان کا بدل ملے گا؟ ان حالات میں بیوی کے ساتھ نباہ کرنا کیا صبر ہے، جس پر میں عند اللہ ماجور ہوں گا؟ یا بے غیرتی ہے، جسے کسی شریف آدمی کو ہرگز برداشت نہیں کرنا چاہیے؟ ان سوالات سے میں ذہنی طور پر از حد پریشان ہوں۔ بہ راہ کرم میرے مسائل کا شریعت کی روشنی میں حل تجویز فرمائیں۔

جواب: نکاح کے ذریعے خاندان کی جو اکائی وجود میں آتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے زوجین میں سے ہر ایک کے لیے باعثِ سکون و طمانینت قرار دیا ہے۔ (الاعراف:۱۸۹، الروم:۲۱)

زوجین اگر اپنے فرائض بہ حسن و خوبی انجام دیں، ایک دوسرے کے حقوق بہ طیبِ خاطر

ادا کریں اور باہم محبت، حسنِ ظن اور اعتماد کی فضا قائم رکھیں تو گھر جنت نظیر بن جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے فرائض سے غفلت برتیں، ایک دوسرے کے حقوق سے بے پروا ہوں اور ان کے باہمی تعلقات کی بنیاد سوءِ ظن، شک وشبہ اور بے اعتمادی پر ہو تو ان کا ازدواجی سکون غارت ہو جاتا ہے اور گھر جہنم کا نمونہ پیش کرنے لگتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے شوہر کو خاندان کا نگراں (قوام) بنایا ہے۔ (النساء:۳۴) اس لیے اس پر خاندان کا ماحول خوش گوار رکھنے کی دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ خطبۂ حجۃ الوداع میں اللہ کے رسول ﷺ نے زوجین میں سے ہر ایک کے حقوق وفرائض تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ لیکن بہ طور خاص شوہروں کو عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرنے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ (صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجة النبی ﷺ، حدیث: ۱۲۱۸، جامع ترمذی، ابواب الرضاع، باب ماجاء فی حق المرأة علی زوجها، حدیث: ۱۱۶۳)

عورت مخصوص مزاج کی حامل ہوتی ہے۔ یہ مزاج اسے بعض مصالح کی بنا پر فطرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے۔ شوہر کی یہ بڑی نادانی ہوگی کہ اس پر حاکمانہ رعب جمائے اور اسے بہ جبر اپنے مزاج کا پابند بنانے کی کوشش کرے۔ عورت کے ساتھ معاملہ اس کے فطری خصائص کی رعایت کرتے ہوئے کرنا چاہیے۔ حدیث میں اسی بات کو ایک بلیغ تشبیہ کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

اِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلْعٍ لَنْ تَسْتَقِيْمَ لَکَ عَلٰی طَرِيْقَةٍ، فَاِنِ اسْتَمْتَعْتَ بِهَا اِسْتَمْتَعْتَ بِهَا وَ بِهَا عِوَجٌ، وَ اِنْ ذَهَبْتَ تُقِيْمُهَا کَسَرْتَهَا وَ کَسْرُهَا طَلَاقُهَا. (صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب المداراة مع النساء، حدیث: ۵۱۸۴، صحیح مسلم، کتاب الرضاع، باب الوصیة بالنساء، حدیث: ۱۴۶۸، الفاظ مسلم کے ہیں)

''عورت پسلی کی مانند پیدا کی گئی ہے، جو تمھارے لیے کسی صورت میں بھی سیدھی نہیں ہوسکتی۔ اگر تم اس کی کجی برقرار رکھتے ہوئے اس سے فائدہ اٹھانا چاہو گے تو فائدہ اٹھا سکو گے اور اگر اسے سیدھا کرنے لگو گے تو اسے توڑ دو گے، اس کا توڑنا طلاق ہے۔''

بخاری اور مسلم کی ایک دوسری روایت میں اس حدیث کے شروع اور آخر میں دونوں جگہ آں حضرت ﷺ نے اِستَوصُوا بِالنِّسَاءِ (عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو) فرمایا ہے۔ (بخاری: ۵۱۸۶، مسلم: ۱۴۶۸)

عورت کو 'ٹیڑھی پسلی' سے تشبیہ دینے کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے ذریعے عورت کے کسی نقص اور عیب کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، بلکہ اس سے مراد یہ کہ جس طرح پسلی کو اس کی فطری بناوٹ پر باقی رکھتے ہوئے ہی اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے اسی طرح عورت کے فطری خصائص کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہی اس کے ساتھ خوش گوار تعلقات قائم رکھے جاسکتے ہیں۔

ہر شخص میں کچھ خوبیاں ہوتی ہیں اور کچھ کم زوریاں۔ شوہر اور بیوی میں سے کوئی بھی اس سے مبرّا نہیں۔ بیوی کی کوئی کم زوری شوہر پر عیاں ہوجائے یا اس کی کوئی بات یا حرکت ناگوار گزرے تو اسے نظروں سے گرا دینا، سخت سست کہنا، اس کے کردار پر شک کرنا اور دوسروں سے اس کی کم زوری بیان کرنا اچھی بات نہیں ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

لاَ يَفْرَكْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً، اِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقًا رَضِيَ مِنْهَا آخَرَ. (صحيح مسلم، كتاب الرضاع، باب الوصية بالنساء، حديث: ١٤٦٩)

''کوئی مومن (شوہر) مومن (بیوی) سے نفرت نہ کرے۔ اگر اس کی کوئی عادت اسے ناگوار ہو تو اس کی کوئی دوسری خصلت اسے ضرور پسند ہوگی۔''

عہد نبوی کا واقعہ ہے۔ ایک شخص نے خدمتِ نبوی میں حاضر ہوکر اپنی بیوی کی شکایت کی۔ اس نے کہا: ''میری بیوی کسی چھونے والے کا ہاتھ نہیں جھٹکتی۔'' (اِنَّ تَحْتِيْ اِمْرَأَةً لَا تَمْنَعُ يَدَ لَامِسٍ) آں حضرت ﷺ نے فرمایا: ''اسے طلاق دے دو۔'' اس شخص نے کہا: میں اس کی جدائی برداشت نہیں کرسکتا (دوسری روایت میں ہے کہ اس نے کہا: وہ مجھے بہت محبوب ہے)۔ آں حضرت ﷺ نے فرمایا: تو اسے روکے رکھو (فَأَمْسِكْهَا)۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: تو اس سے لطف اندوز ہوتے رہو (اِسْتَمْتِعْ بِهَا)۔ (سنن نسائی، کتاب النکاح، باب تزويج الزانية، حديث: ٣٢٢٩ كتاب الطلاق، باب ماجاء فى الخلع، حديث: ٣٤٦٤، ٣٤٦٥)

بعض شارحینِ حدیث نے اس جملہ (لا تمنع ید لامس) کو زنا سے کنایہ مانا ہے۔ لیکن یہ بات قابل قبول نہیں معلوم ہوتی۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ سے توقع نہیں کی جاسکتی کہ آپؐ کسی شخص کو کسی زانیہ عورت سے رشتہ استوار رکھنے کا مشورہ دیں گے۔ درحقیقت اس میں عورت کے اسی رویہ کا بیان ہے، جس کی شکایت اوپر کے سوال میں کی گئی ہے۔

بعض حضرات ازدواجی تلخیوں کی ابتدا ہی میں طلاق کی بات کرنے لگتے ہیں۔ وہ عورت کی سرکشی پر اسے قابو میں کرنے کے لیے طلاق کی دھمکی دیتے ہیں اور جب اس میں کام یاب نہیں ہو پاتے تو اس حربے کو استعمال کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ شیطان کو سب سے زیادہ خوشی اس بات سے ہوتی ہے کہ میاں بیوی میں جدائی ہو جائے اور خاندان کا شیرازہ منتشر ہو جائے۔ (صحیح مسلم، کتاب صفة القیامة، باب تحریش الشیطان و بعثه سرایاه لفتنة الناس، حدیث: ۲۸۱۳) طلاق کی حیثیت آخری چارۂ کار کی ہے نہ کہ اولین اقدام کی۔ قرآن نے بیوی کی سرکشی (نشوز) کی صورت میں اس سے قبل متعدد تدابیر تجویز کی ہیں (النساء:۳۴)۔ انھیں عمل میں لانا چاہیے۔

عورت بھی جذبات اور احساسات رکھنے والی ایک مخلوق ہے۔ ضروری ہے کہ مرد اس کے جذبات، خواہشات اور میلانات کے سلسلے میں حساس ہو، وہ اس کی دل جوئی کرے، اس کے ساتھ فرحت و انبساط اور خوش طبعی سے پیش آئے، اس کی جائز خواہشات پوری کرے، اس کی باتوں کو توجہ سے سنے، اس کے شکوے شکایات کا ازالہ کرنے کی کوشش کرے، اس کے ساتھ گھر میں اور گھر سے باہر بھی کچھ وقت گزارے، اس کے سامنے اس کے رشتہ داروں کا تذکرہ احترام اور محبت سے کرے۔ اسے تحفے تحائف لا کر دے، اس کے چھوٹے بڑے کاموں (مثلاً کھانا پکانا، سینا پرونا وغیرہ) کی تعریف کرے۔ اس سے نہ صرف محبت کرے، بلکہ وقتاً فوقتاً اس کا اظہار بھی کرتا رہے۔ ان تدابیر کے ذریعے بیوی کا دل جیتا جاسکتا ہے اور ازدواجی زندگی کو خوش گوار بنایا جاسکتا ہے۔

آخر میں اپنی بہنوں سے بھی یہ کہنا چاہوں گا کہ جہاں ان کے شوہروں پر ان کے کچھ حقوق ہیں، وہیں شوہروں کے بھی ان پر کچھ حقوق عائد ہوتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کے

نزدیک محبوب اور نیک عورت وہ ہے، جو خوش دلی کے ساتھ شوہر کے حقوق ادا کرے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ سے کسی نے دریافت کیا: بہترین عورت کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

اَلَّذِیْ تَسُرُّهٗ اِذَا نَظَرَ، وَ تُطِیْعُهٗ اِذَا أَمَرَ، وَلاَ تُخَالِفُهٗ فِیْمَا یَکْرَهُ فِیْ نَفْسِهَا وَمَالِهٖ. (مسند احمد، ۲/۲۵۱، ۴۳۲، ۴۳۸)

''وہ عورت جس کا شوہر اسے دیکھے تو خوش ہو جائے، اسے کسی چیز کا حکم دے تو اسے بجا لائے اور اس کی ذات اور اپنے مال کے بارے میں جس چیز کو ناپسند کرتا ہو اس کا ارتکاب نہ کرے۔''

طلاق کے بعد حلالہ کا حکم

سوال: میں فوج میں ملازمت کر رہا ہوں۔ میرے بہت سے ساتھی غیر مسلم ہیں، وہ وقتاً فوقتاً اسلام پر اعتراض کرتے رہتے ہیں۔ ایک موقعے پر ایک صاحب نے یہ اعتراض کیا کہ ''اسلام میں بیوی کو طلاق دینے کے بعد اسے واپس لینے کے لیے حلالہ کرانا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یہ تو طوائف گیری جیسا کام ہوا'' میں نے انھیں جواب دینے کی کوشش کی لیکن اس جواب سے وہ مطمئن نہ ہو سکے۔ آپ سے گزارش ہے کہ اس اعتراض کا اطمینان بخش جواب مرحمت فرمائیں۔ یہ اعتراض عموماً غیر مسلموں کی جانب سے کیا جاتا ہے۔

جواب: آپ کے غیر مسلم دوست کا اعتراض یہ ہے کہ ''اسلام میں بیوی کو طلاق دینے کے بعد اسے واپس لینے کے لیے حلالہ کرانا ضروری قرار دیا گیا ہے، یہ تو طوائف گیری جیسا کام ہوا'' انھوں نے پہلے تو اپنی طرف سے یہ فرض کر لیا کہ ''اسلام میں حلالہ کرانا ضروری قرار دیا گیا ہے'' اور پھر اس پر اعتراض جڑ دیا۔ اس سے واضح ہو رہا ہے کہ وہ اسلام کے ضابطۂ طلاق کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہیں۔ اس غلط فہمی میں اضافہ مسلمانوں کی بدعملی سے ہوتا ہے، جو نہ صرف یہ کہ اسلام کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل نہیں کرتے، بلکہ اپنی ذاتی خواہشات پوری کرنے کے لیے ایسے طریقے اختیار کرتے ہیں، جنھیں اسلام میں سخت ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ سطور ذیل میں

اسلام کے ضابطۂ طلاق کی مختصر وضاحت کی جارہی ہے۔ امید ہے کہ اس سے مذکورہ اعتراض خود بہ خود رفع ہوجائے گا۔

اسلام نے معاشرتی زندگی کے، جو اصول دیے ہیں وہ انسانی نفسیات سے پوری طرح ہم آہنگ اور حکمتوں پر مبنی ہیں۔ اس نے نکاح کا مقصد نسل انسانی کی بقا کے ساتھ زوجین کے مابین ہم آہنگی اور باہم محبت ومودت قرار دیا ہے اور زوجین کو ایک دوسرے کے لیے باعث سکون قرار دیا ہے۔ قرآن میں ہے:

وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَ جَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً ؕ (الروم:۲۱)

''اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمھارے لیے تمھاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں، تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمھارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کردی۔''

طلاق کو وہ سخت ناپسندیدہ عمل قرار دیتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَی اللّٰهِ تَعَالٰی الطَّلَاقُ ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک جائز کاموں میں سب سے ناپسندیدہ کام طلاق دینا ہے۔'' (سنن ابو داؤد، کتاب الطلاق، باب فی کراهیة الطلاق، حدیث: ۲۱۷۸، ضعّفه الألبانی) دوسری حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''شیطان کو سب سے زیادہ خوشی اس بات سے ہوتی ہے کہ کسی خاندان کا شیرازہ منتشر ہوجائے اور میاں بیوی میں علیحدگی ہوجائے۔'' (صحیح مسلم، کتاب صفة القیامة، حدیث: ۲۸۱۳)

طلاق کو سخت ناپسندیدہ عمل قرار دینے کے باوجود اسلام نے اس پر پابندی عائد نہیں کی اور اسے یکلخت ممنوع نہیں قرار دیا، اس لیے کہ ایسا کرنا معاشرتی تقاضوں اور مصلحتوں کے برخلاف ہوتا۔ بسا اوقات زوجین میں ذہنی ناموافقت پائی جاتی ہے، اس وجہ سے یا دیگر اسباب سے، باوجود ہزار کوششوں کے ان کی یکجائی ممکن نہیں رہتی۔ ایسے حالات میں ایک صورت تو یہ تھی کہ ایک بار نکاح ہوجانے کے بعد زوجین کو مجبور کیا جائے کہ وہ ہر حال میں نباہ کریں، خواہ ایک

دوسرے کو کتنا ہی ناپسند کرتے ہوں اور خواہ ان میں ادنیٰ سی بھی موافقت نہ پائی جاتی ہو۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں کو اختیار دے دیا جائے کہ اگر باوجود ہزار کوششوں کے کسی بھی صورت میں نباہ ممکن نہ ہو تو خوش اسلوبی کے ساتھ علیٰحدگی اختیار کرلیں۔ اسلام نے دونوں صورتوں میں سے دوسری صورت اختیار کی ہے، اس لیے کہ یہی انسانی نفسیات اور معاشرتی تقاضوں کے عین مطابق تھی۔ جن مذاہب نے (مثلاً ہندومت اور عیسائیت) پہلی صورت کو ترجیح دی اور طلاق پر قطعی پابندی عائد کردی ہے ان میں زوجین ناموافقت کی صورت میں گھٹ گھٹ کر زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں، یا شوہر اور اس کے گھر والے عورت سے گلوخلاصی کے لیے اسے نذر آتش کردینے میں عافیت محسوس کرتے ہیں۔ اس قسم کے واقعات آئے دن ہمارے مشاہدے میں آتے رہتے ہیں۔ اسلام نے طلاق کی اجازت بہ درجۂ مجبوری اس وقت دی ہے جب زوجین کے درمیان موافقت کی تمام تدابیر ناکام ہوگئی ہوں۔ اس سے پہلے وہ متعدد اقدامات کی ہدایات کرتا ہے اور طلاق بھی وہ تدریجاً دینے کا حکم دیتا ہے۔ ان اقدامات کی تفصیل یہ ہے۔

۱- اگر بیوی کی طرف سے نافرمانی اور سرکشی کا مظاہرہ ہو تو اسلام نے مرد کو حکم دیا ہے کہ وہ اسے سمجھائے بجھائے۔ اس کا بستر جدا کردے اور ضرورت ہو تو اسے ہلکی جسمانی سزا دے۔ قرآن میں ہے:

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ

(النساء:۳۴)

''اور جن عورتوں کی سرکشی کا تمھیں اندیشہ ہو ان کو سمجھاؤ، ان کے بستر جدا کردو اور انھیں مارو۔ اگر وہ اطاعت کرنے لگیں تو پھر ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرو۔''

حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے بیوی کو ایسی مار مارنے سے منع فرمایا ہے، جس سے اس کا بدن زخمی ہو جائے۔ (صحیح مسلم۔ کتاب الحج۔ باب حجۃ النبی) گھر میں رہتے ہوئے قطع تعلق ایک ایسی سزا ہے، جسے بیوی زیادہ دنوں تک نہیں جھیل سکتی۔ لامحالہ وہ شوہر کی اطاعت و فرماں برداری پر مجبور ہوگی۔

۲- بسا اوقات زوجین کو ایک دوسرے سے ایسی شکایات ہوتی ہیں، جن کا وہ خود باہم مل کر ازالہ کرنے پر قادر نہیں ہوتے۔ ایسی صورت میں اسلام حکم دیتا ہے کہ دونوں کے خاندان کا ایک ایک نمائندہ مل بیٹھ کر تنازعہ کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ قرآن میں ہے:

وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا ؕ (النساء:۳۵)

''اگر تم میں میاں بیوی کے درمیان اختلاف کا اندیشہ ہو تو ایک حکم (فیصلہ کرنے والا) شوہر کے گھر والوں میں سے اور ایک حکم بیوی کے گھر والوں میں سے بھیجو، اگر وہ دونوں معاملہ کو سدھارنا چاہیں تو اللہ ان کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا۔''

۳- اگر اس صورت میں بھی مسئلہ جوں کا توں باقی رہے تو اسلام حکم دیتا ہے کہ شوہر بیوی کو صرف ایک طلاق طہر (یعنی جب ماہواری نہ آ رہی ہو) کی حالت میں دے۔ طہر کی شرط اس لیے ہے کہ اس حالت میں معمول کے تعلقات زن و شو ہونے سے سنجیدہ طلاق کی توقع کی جاسکتی ہے، جب کہ حالت حیض میں اس تعلق کے نہ ہونے سے غصے، جھنجھلاہٹ اور ردعمل کی کیفیات کی شمولیت ہوسکتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ بیوی کو اپنے رویہ پر غور کرنے کا موقع مل سکے اور شوہر بھی اپنے اقدام پر سنجیدگی سے غور کر سکے۔ اس کو طلاق رجعی کہتے ہیں۔ یعنی شوہر عدت کے اندر جس وقت چاہے بیوی کو واپس لے سکتا ہے۔ محض زبان سے واپس لینے کا اظہار یا عمل سے اس کا ثبوت کافی ہے۔ نکاح کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر عدت گزر جائے تو از سر نو نکاح کی ضرورت ہوگی۔

۴- اگر ایک طلاق واقع ہو جانے کے باوجود زوجین دوبارہ میاں بیوی کی حیثیت سے رہنے پر آمادہ نظر نہ آئیں تو اسلام شوہر کو اجازت دیتا ہے کہ وہ اگلے طہر میں دوسری طلاق دے۔ یہ طلاق بھی رجعی ہوگی، یعنی عدت کے اندر شوہر رجوع کر سکتا ہے۔ لیکن اگر عدت گزر جائے تو یہ طلاق بائن ہو جائے گی یعنی ان دونوں کے درمیان علیحدگی ہوگئی، ان کا ازدواجی تعلق ختم ہو گیا اور بیوی کی حیثیت عام عورتوں کی سی ہوگئی۔ اب اگر شوہر اسے واپس لینا چاہے تو اس طرح واپس نہیں لے سکتا، جس طرح طلاق رجعی کے بعد اسے واپس لینے کا اختیار تھا، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ اب

اسے واپس لینے کی کوئی صورت نہ ہو، بلکہ اسلام کا حکم یہ ہے کہ اگر دو طلاق کے بعد وہ دوبارہ ازدواجی زندگی گزارنے پر رضامند ہو جائیں تو وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ البتہ اس کے لیے ان کے درمیان از سر نو نکاح ہونا ضروری ہے۔ قرآن میں ہے:

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ص فَاِمۡسَاکٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِیۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ط

(البقرہ:۲۲۹)

’’طلاق دو مرتبہ ہے اس کے بعد یا تو شوہر بیوی کو اچھی طرح رکھے یا خوش اسلوبی سے چھوڑ دے۔‘‘

از سر نو نکاح کی صورت میں عورت دوبارہ مہر کی مستحق ہوگی۔

۵- اگر دو طلاق کے بعد وہ از سر نو نکاح کر کے ازدواجی زندگی گزارنے پر رضامند تو ہو جائیں، لیکن ان کے درمیان موافقت اور سدھار پائیدار نہ ہو اور پھر ایسے اختلافات رونما ہو جائیں کہ وہ قطع تعلق پر آمادہ ہو جائیں تو اسلام انھیں اس آزادی اور حق سے محروم تو نہیں کرتا، لیکن ساتھ ہی شوہر کو سخت تاکید کرتا ہے کہ وہ تیسری مرتبہ طلاق بہت سوچ سمجھ کر دے۔ طلاق بچوں کا کھیل نہیں کہ جب جی چاہا بیوی کو طلاق دے دی اور جب جی چاہا اسے واپس لے لیا۔ وہ نکاح کو ایک محترم و مقدس رشتہ قرار دیتا ہے۔ اس کے تقدس کو قائم رکھنے کے لیے ہی وہ شوہر کو وارننگ دیتا ہے کہ اگر اس نے تیسری مرتبہ بھی طلاق دے دی تو اب بیوی اس کے لیے قطعاً حرام ہو جائے گی۔ اب وہ اسے واپس نہیں لے سکتا۔ جو شوہر اپنی بیوی کو ایک بار نہیں، دو بار نہیں، بلکہ تین بار طلاق دے چکا ہو وہ اس قابل نہیں کہ اب وہ عورت اس کی بیوی بن کر رہ سکے۔ وہ اس مرد کو اس عورت سے بالکلیہ محروم کر کے اب سماج کے دوسرے مردوں کو اجازت دیتا ہے کہ اس عورت کو بے یار و مددگار نہ چھوڑیں، بلکہ اسے اپنی زوجیت میں لیں۔ اس عورت کے پہلے شوہر کی حیثیت اب عام مردوں کی سی ہوگئی۔ وہ اس عورت سے دوبارہ نکاح اس لیے نہیں کر سکتا کہ وہ کسی دوسرے کی زوجیت میں چلی گئی ہے۔ لیکن اگر دوسرا شوہر بھی اسے طلاق دے دے یا اس کی وفات ہو جائے اور اب وہ دونوں (یعنی عورت اور اس کا پہلا شوہر) پھر رشتۂ زوجیت میں منسلک ہونا چاہیں تو اسلام انھیں ایسا کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ قرآن میں ہے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ (البقرہ:۲۳۰)

''پھر اگر شوہر (تیسری مرتبہ) طلاق دے دے تو وہ عورت اس کے لیے حلال نہ ہوگی، جب تک کہ کسی دوسرے مرد سے اس کا نکاح نہ ہو جائے اور وہ اسے طلاق نہ دے دے (اگر دوسرا شوہر بھی اسے طلاق دے دے) تو کوئی حرج نہیں ہے اگر وہ دونوں دوبارہ باہم نکاح کرنا چاہیں۔ اگر انھیں امید ہو کہ وہ اللہ کی بتائی ہوئی حدود پر قائم رہیں گے۔''

اسلام کے نظام طلاق کو اتنی تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی، تاکہ واضح ہو سکے کہ اس نے، جن حالات میں طلاق کی اجازت دی ہے اور اس کا جو طریقہ بتایا ہے وہ سراسر انسانوں کے لیے رحمت ہے اور اس میں انسانی نفسیات اور معاشرتی پیچیدگیوں اور ضرورتوں کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔

غلط فہمی دراصل مسلمانوں کے اسلامی طریقہ طلاق سے ناواقفیت اور غلط طریقے سے طلاق دینے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ آج کل مسلمان کسی بات پر طیش میں آکر بیک زبان تین طلاقیں دے کر بیوی کو علیحدہ کر دیتا ہے اور اس آسانی سے خود کو محروم کر لیتا ہے، جو اسے اسلام نے تین طہروں میں الگ الگ طلاق دینے کا حکم دے کر فراہم کی تھی۔ پھر جب جلد ہی اپنے کیے پر پچھتاتا ہے تو بیوی کو واپس لینے کی کوئی تدبیر اس کے سامنے نہیں ہوتی، اس کے سوا کہ وہ کسی دوسرے شخص کو اس بات پر رضا مند کر لے کہ وہ اس عورت سے نکاح کر کے اسے طلاق دے دے، تاکہ دوبارہ اس کے لیے اس عورت سے نکاح جائز ہو جائے۔ اس عمل کو حلالہ کہتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک غلط طریقہ ہے۔ جو شخص حلالہ کرواتا ہے وہ بھی غلط کام کرتا ہے اور جو شخص اس پر رضا مند ہوتا ہے وہ بھی ایک گھناؤنی حرکت کرتا ہے۔ اسلام میں اس طریقے کو سخت ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے:
ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

لَعَنَ اللّٰهُ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهُ. (سنن ابن ماجه۔ كتاب النكاح، باب المحلّل والمحلّل له، حديث: ١٩٣٤، ١٩٣٥)

''جو شخص حلالہ کرتا ہے اور جو شخص حلالہ کرواتا ہے دونوں پر اللہ کی لعنت ہے۔''

ایک دوسری حدیث میں آپؐ نے ایسے شخص کے بارے میں سخت ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے 'کرایے کا سانڈ' (التَّيْسُ الْمُسْتَعَار) قرار دیا ہے۔

(سنن ابن ماجہ، حوالہ سابق حدیث: ۱۹۳۶)

آخری بات یہ کہ غیر مسلم بھائیوں سے گفتگو کرتے وقت ترجیحات طے کر لینی چاہیں۔ جب تک اصول وکلیات کے سلسلے میں ذہن صاف نہ ہو، جزئیات پر گفتگو نہ صرف یہ کہ نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی، بلکہ اکثر وبیش تر التباس اور سوال در سوال کا پیش خیمہ بھی بنتی ہے۔

دورانِ عدّت عورت کا لباس

سوال: کیا شوہر کی وفات کے بعد عورت کے لیے دورانِ عدت سونے یا چاندی کے زیورات، جیسے چوڑی، بندے، انگوٹھی اور سونے کی زنجیر (Chain) والی گھڑی کا استعمال جائز ہے یا ناجائز؟ زیور کے علاوہ اس کو سرمہ لگانے اور سر میں تیل ڈالنے کی اجازت ہے یا نہیں؟ اسے کیسا لباس پہننا چاہیے؟

جواب: شوہر کی وفات کے بعد عورت کے لیے عدت کا حکم قرآن کریم میں واضح طور پر موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا ۚ (البقرہ:۲۳۴)

''تم میں سے جو لوگ مرجائیں، ان کے پیچھے اگر ان کی بیویاں زندہ ہوں، تو وہ اپنے آپ کو چار مہینے دس دن روکے رکھیں۔''

''تَرَبُّص'' (روکے رکھنے) سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ اس مدت میں وہ عورتیں نکاح نہ کریں، بلکہ اس سے مراد اپنے آپ کو زیب وزینت سے بھی روکے رکھنا ہے۔ فقہی اصطلاح

میں اسے ''احداد'' کہتے ہیں۔ بہ کثرت احادیث میں زمانۂ عدت میں عورت کو زیورات اور رنگین کپڑے پہننے اور مہندی، سرمہ، خوش بو اور خضاب لگانے سے منع کیا گیا ہے۔

ام المؤمنین حضرت ام حبیبہ بنت ابی سفیانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لاَ يَحِلُّ لِاِمْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ اَنْ تُحِدَّ فَوْقَ ثَلاَثٍ اِلَّا عَلٰى زَوْجٍ فَاِنَّهَا تُحِدُّ عَلَيْهِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْراً.

(بخاری، کتاب الجنائز، باب احداد المرأة علی غیر زوجها، حدیث: ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، مسلم، کتاب الطلاق، باب وجوب الاحداد فی عدة الوفاة، حدیث: ۱۴۸۶، ۱۴۸۷)

''کسی عورت کے لیے، جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتی ہو، جائز نہیں کہ کسی کے مرنے پر تین دن سے زیادہ سوگ منائے، سوائے شوہر کے کہ اس کی وفات پر وہ چار ماہ دس دن سوگ کرے گی۔''

حضرت ام حبیبہؓ سے مروی یہ حدیث صحیحین کے علاوہ موطا امام مالک (۲۶۲۸)، سنن ابی داؤد (۲۲۹۹)، سنن ترمذی (۱۱۹۵) اور سنن نسائی (۳۵۲۷) میں بھی ہے۔ صحیح مسلم (۱۴۹۰)، جامع ترمذی (۱۱۹۶)، سنن نسائی (۳۵۲۵، ۳۵۲۶) اور موطا امام مالک (۲۶۲۸) میں حضرت عائشہؓ، حضرت زینب بنت جحشؓ اور حضرت حفصہؓ سے بھی مروی ہے۔

عہدِ جاہلیت میں عورتیں شوہر کی وفات کے بعد ایک سال تک سوگ مناتی تھیں۔ اس مدت میں وہ کوٹھری میں گزارہ کرتی تھیں، خراب کپڑے پہنتی تھیں اور خوش بو وغیرہ نہیں لگاتی تھیں۔ (سنن النسائی، کتاب الطلاق، باب ترك الزينة للحادة، حديث: ۳۵۳۳) قرآن نے اس کی مدت چار ماہ دس دن قرار دی۔

بعض احادیث میں یہ صراحت بھی ملتی ہے کہ دورانِ عدت عورت کو کن چیزوں سے احتراز کرنا چاہیے۔ حضرت ام عطیہؓ فرماتی ہیں:

''ہمیں منع کیا جاتا تھا کہ کسی کی وفات پر تین دن سے زیادہ سوگ نہ منائیں، سوائے شوہر کے کہ اس کی وفات پر چار ماہ دس دن سوگ منانے کا حکم تھا۔ اس عرصے میں

سرمہ اور خوش بو لگانے اور (خوش بودار) رنگین کپڑا پہننے سے ہمیں روکا جاتا تھا، ہاں حیض سے طہارت کے بعد تھوڑی خوش بو لگا لینے کی اجازت تھی۔''

(صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب وجود الاحداد، حدیث:۹۳۸)

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لاَ تَلْبَسُ الْمُتَوَفّٰی عَنْهَا زَوْجُهَا الْمُعَصْفَرَ مِنَ الثِّيَابِ وَلاَ الْمُمَشَّقَةِ وَلاَ الْحُلٰی وَلاَ تَخْتَضِبُ وَلاَ تَكْتَحِلُ. (سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی ما تجتنبه المعتدةفی عدّتها، حدیث: ۲۳۰٤، سنن النسائی، کتاب الطلاق، باب ما تجتنب الحادّة من الثیاب المصبغة، حدیث: ۲۵۳۵)

''جس عورت کے شوہر کی وفات ہوگئی ہو وہ نہ (خوش بودار) رنگین کپڑے پہنے، نہ زیورات کا استعمال کرے، نہ خضاب اور سرمہ لگائے۔''

ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے پہلے شوہر حضرت ابوسلمہؓ کی وفات ہوگئی۔ دورانِ عدّت ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ان سے ملنے گئے۔ وہ آنکھوں میں صبر لگائے ہوئے تھیں۔ آں حضرت ﷺ نے فرمایا: ''اے ام سلمہ! یہ کیا ہے؟ عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ صبر ہے۔ اس میں خوش بو نہیں ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اس سے چہرے میں حسن آجاتا ہے، اس لیے اس کا استعمال صرف رات میں کرو، دن میں نہ کرو۔ اسی طرح نہ سر میں خوش بودار تیل لگاؤ، نہ مہندی لگاؤ۔ انھوں نے عرض کیا: پھر سر میں کیا لگاؤں؟ فرمایا: سدر لگا سکتی ہو۔'' (سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فیما تجتنبه المعتدة فی عدّتها، حدیث: ۲۳۰۵، ضعّفه الالبانی)

حضرت ام سلمہؓ عورتوں کو بتایا کرتی تھیں کہ:

''وہ دورانِ عدت سرمۂ اثمد نہ لگائیں۔ ہاں اگر بہت ضروری ہو تو رات میں اس کا استعمال کرلیا کریں اور دن میں پونچھ دیا کریں۔ اسی طرح وہ یہ بھی کہا کرتی تھیں کہ عورت دورانِ عدت سدر اور روغن زیتون لگا سکتی ہے۔'' (موطا امام مالك، کتاب الطلاق، باب ماجاء فی الاحداد، حدیث: ۲۶۳۳، ۲٦٤٤ سنن نسائی، کتاب الطلاق، باب الرخصة للحادّة ان تمتشط بالسدر، حدیث ۳۵۳۷، ضعّفه الالبانی)

اس تفصیل سے واضح ہے کہ عورت دورانِ عدت ہر اس چیز سے اجتناب کرے گی، جسے شرعاً یا عرفاً زینت سمجھا جاتا ہے اور اس سے اس کی شخصیت پر کشش بنتی ہے۔ اس بات پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔ البتہ بعض جزئیات میں ان کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثلاً حنفیہ عورت کے لیے دورانِ عدّت کنگھی کرنے کو بھی مکروہ قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ اسے زینت میں شمار کرتے ہیں۔ اسی طرح حنفیہ وشوافع غیر خوش بودار تیل مثلاً روغن زیتون وغیرہ کے استعمال سے بھی منع کرتے ہیں۔ جب کہ مالکیہ اور حنابلہ اس کی اجازت دیتے ہیں۔ سونے کے زیورات کا استعمال ممنوع ہونے پر ان کا اتفاق ہے۔ امام غزالی شافعیؒ چاندی کی انگوٹھی پہننے کی اجازت دیتے ہیں۔

دورانِ عدت عورت کو ایسے کپڑے نہیں پہننے چاہئیں، جنھیں عرف میں زینت سمجھا جاتا ہے۔ خواہ ان کا رنگ کچھ بھی ہو۔ (الموسوعة الفقهية، ۲/۱۰۷-۱۰۹)

مسئلہ ظہار

سوال: ہمارے علاقے میں ایک عجیب طرح کا مسئلہ پیش آیا۔ ایک صاحب نے کسی بات پر ناراض ہوکر اپنی بیوی سے کہہ دیا کہ ''تم میرے لیے حضرت فاطمہؓ کے برابر ہو'' بعد میں وہ پشیمان ہوئے۔ مقامی علماء سے مسئلہ معلوم کیا۔ بعض علماء کی یہ رائے سامنے آئی کہ اس جملے سے ظہار ثابت ہوگیا۔ اب بیوی اس شخص پر حرام ہوگئی۔ ظہار کا مسئلہ قرآن میں سورۂ مجادلہ کے شروع میں بیان ہوا ہے۔ میں نے بعض کتبِ تفسیر سے رجوع کیا، لیکن مسئلہ منقح ہوکر میرے سامنے نہ آسکا۔ تفہیم القرآن میں مولانا مودودیؒ نے اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ لیکن انھوں نے اس سلسلے میں فقہاء کے اختلافات بیان کردیے ہیں۔ اپنی طرف سے کوئی قطعی بات نہیں لکھی ہے۔ میری نظر میں ظہار میں صرف خونی رشتے ماں، بہن، بیٹی، خالہ، پھوپھی وغیرہ یا رضاعت کے رشتے ہی آتے ہیں۔ اس میں عام عورتوں کو بھی شامل کرنا نصِ قرآن کے خلاف ہے۔ بہ راہِ کرم وضاحت فرمائیں کہ کیا صورت مسئولہ میں ظہار ثابت ہوگیا؟

جواب: آپ نے جو مسئلہ دریافت کیا ہے اس پر میں نے بھی غور کیا اور یہاں کے چند علماء سے بھی رجوع کیا۔ سب کی رائے ہے کہ کسی شخص کا اپنی بیوی سے یہ کہنا کہ ''تم میرے لیے حضرت

فاطمہؓ کے برابر ہو۔'' مسئلہ ظہار کو ثابت نہیں کرتا۔ آپ کی یہ بات صحیح ہے کہ ''ظہار میں صرف خونی رشتے، ماں، بہن، بیٹی، خالہ، پھوپھی وغیرہ یا رضاعت کے رشتے ہی آتے ہیں۔ اس میں عام عورتوں کو بھی شامل کرنا نصِ قرآن کے خلاف ہے۔''

مذکورہ شخص نے ایک لغو اور بے ہودہ بات کہی ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کرنا چاہیے اور بیوی کی بدخلقی کے باوجود اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا چاہیے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

لاَ يَفْرَكْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً، اِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقًا رَضِيَ مِنْهَا آخَرَ. (مسلم، كتاب الرضاع، باب الوصية بالنساء، حديث: ١٤٦٩)

''کوئی مومن (مرد) کسی مومن عورت (بیوی) سے نفرت نہ کرے۔ اگر اس کی کوئی ایک عادت اسے ناگوار ہوگی تو دوسری اسے پسند آئے گی۔''

حجاب اور برقعہ

سوال: کہا جاتا ہے کہ قرآن میں پردے کے تناظر میں برقعہ پہننے کا صریح حکم موجود نہیں ہے۔ اس لیے صرف اوڑھنی سے سر اور چہرے کا پردہ کرنا اور ساتھ ہی جہاں تک ہو سکے جسم کا ڈھکنا کافی ہے۔ اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چوں کہ ہمارے یہاں کے مخصوص حالات کی وجہ سے تلاشی کے دوران برقعہ والی خواتین کا برقعہ ہٹا کر تلاشی لی جاتی ہے اس لیے بھی برقعہ نہ پہننا بہتر ہے۔

جہاں تک میرا علم ہے، برقعہ اوڑھنا اسلامی شعار ہے اور برقعہ یا حجاب کا صریح حکم قرآن میں ڈھونڈنا ناروا ہے۔ جب کہ سنت سے حجاب کی اہمیت اور فرضیت واضح ہے۔

دوپٹے، اوڑھنی یا چادر سے سر، چہرے اور جسم کو ڈھانکنا میرے خیال میں ناکافی ہی نہیں، بلکہ دعوتِ نظارہ کے مترادف ہے۔ چوں کہ عموماً ہم لوگ باہر نکلتے وقت اہتمام سے نئے، خوش رنگ اور نظر کو بھلے لگنے والے کپڑے زیب تن کرتے ہیں، ساتھ ہی عورتیں عام استعمال کے کپڑے بھی فیشن کو ملحوظ رکھ کر خریدتی ہیں۔ اس لیے اس طرح کے کپڑوں کو پردہ کیسے تصور کیا

جاسکتا ہے؟ جہاں تک تلاشی کے دوران تنگ کیے جانے کا سوال ہے تو میرے خیال میں اس وجہ سے حجاب ترک کرنا بھی گناہ ہے۔ اسے ہم اضطراری حالت تو نہیں کہہ سکتے۔ بھلے ہی انسان دل کو مطمئن کرنے کے لیے کتنے بھی بہانے بنالے، ویسے بھی پردہ دار خواتین کے ساتھ بلاوجہ زیادتی کوئی بھی غیر مسلم، چاہے وہ پولیس والا ہو یا فوجی، نہیں کرتا۔ الا احیاناً۔

یونیورسٹی، آفسوں اور خصوصاً ہسپتالوں میں لڑکے اور لڑکیاں سارا سارا دن گفتگو اور ہنسنے مسکرانے میں گزار دیتے ہیں۔ سمجھانے یا منع کرنے پر کہا جاتا ہے کہ ہم تو اسلام کے بارے میں Discuss کرتے ہیں۔ یہ کون سا اسلام ہے، جس پر اجنبی اور غیر محرم مرد و زن بے پردگی اور عریانیت کے ساتھ مل کر Discuss کر سکتے ہیں۔ ایک تو حرام کام اور پھر اس پر ''اسلام پر Discuss'' کر کے ثواب بھی کمایا جارہا ہے۔

یہ حالات سخت ذہنی کوفت کا سبب ہیں، لیکن ہماری بات اس لیے اثر نہیں کرتی کہ ہم دینی تعلیم تو برائے نام بھی کسی مدرسے سے حاصل نہیں کر پائے، صرف مروجہ تعلیم کے ساتھ گھر پر والدین کی توجہ سے تھوڑا سا دین کا علم ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ مذکورہ بالا امور پر خصوصی توجہ سے ہماری رہ نمائی فرمائیے۔ شاید کہ کسی پر اثر ہو۔

جواب: قرآن کریم میں مومن مردوں اور عورتوں کی معاشرت کے بارے میں واضح احکام دیے گئے ہیں۔ خاص طور سے عورتوں کے بارے میں اس میں صراحت سے بیان کیا گیا ہے کہ ان کا رہن سہن گھروں میں کس طرح ہو اور وہ باہر نکلیں تو کس طرح نکلیں؟ اس سلسلے میں ہمیں سورۂ نور اور سورۂ احزاب کی آیات کو اپنے پیش نظر رکھنا چاہیے۔

سورۂ نور میں پہلے اہل ایمان مردوں اور اہل ایمان عورتوں کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ۝ وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ يَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ

(النور: ۳۰-۳۱)

''(اے نبیؐ) مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے، جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے۔ اور (اے نبیؐ) مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔''

پھر اہل ایمان عورتوں کو مزید حکم دیا گیا کہ وہ اپنی زینت کا کھلے عام اظہار نہ کریں۔ اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رکھیں اور اپنے قریبی رشتے داروں اور متعلقین، (شوہر، باپ، خسر، بیٹے، شوہروں کے بیٹے، بھائی، بھتیجے، بھانجے، میل جول کی عورتیں، زیردست مرد، بچے) کے علاوہ کسی کے سامنے اپنی زینت کا اظہار نہ کریں:

وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۖ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَامَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِى الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۖ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ۭ (النور:۳۱)

''اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے، جو خود ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔ وہ اپنا بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں مگر ان لوگوں کے سامنے: شوہر، باپ، شوہروں کے باپ، اپنے بیٹے، شوہروں کے بیٹے، بھائی، بھائیوں کے بیٹے، بہنوں کے بیٹے، اپنے میل جول کی عورتیں، اپنے لونڈی غلام، وہ زیردست مرد جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں، اور وہ بچے، جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف نہ ہوئے ہوں۔ وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہو اس کا لوگوں کو علم ہو جائے۔''

سورۂ احزاب میں اہل ایمان عورتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ط (الاحزاب:۵۹)

''اے نبیؐ، اپنی بیویوں، بیٹیوں اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلّو لٹکا لیا کریں۔''

اس آیت میں جلابیب (واحد جلباب) کا لفظ آیا ہے۔ یہ خمر (واحد خمار) یعنی اوڑھنی سے الگ چیز ہے۔ جلباب اوڑھنی سے بڑے کپڑے کو کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ نے اس سے مراد چادر لی ہے۔ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں: صحیح بات یہ ہے کہ اس سے مراد وہ کپڑا ہے، جس سے پورا بدن ڈھک جائے۔ (تفسیر قرطبی، ۲۴۳/۱۴)

معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں عورتوں کے لیے گھروں سے باہر نکلنے کے آداب بیان کیے گئے ہیں کہ جب وہ کسی ضرورت سے گھر سے باہر نکلیں تو اپنے جسم کو کسی بڑے کپڑے مثلاً چادر وغیرہ سے اچھی طرح ڈھانپ کر نکلیں اور پوری احتیاط کریں کہ ان کی زینت کا اظہار نہ ہو۔

برصغیر میں عام طور پر جس برقعہ کا چلن ہے وہ اس ضرورت کی بہ خوبی کفایت کرتا ہے۔ لیکن اسے 'اسلامی شعار' قرار دے کر لازم کرنا اور اس کا التزام نہ کرنے والی خواتین کو اسلامی شعار سے بے پروا قرار دینا میری نظر میں غلو ہے۔ اسلام نے خواتین کو کسی مخصوص لباس کا پابند نہیں کیا ہے، بلکہ اس کی کچھ شرائط بیان کر دی ہیں۔ جس لباس میں بھی وہ شرائط پوری ہوں اسے پہنا جا سکتا ہے۔ مروج برقعہ کے علاوہ بھی مسلمان خاتون کسی غیر جاذب نظر چادر وغیرہ سے اپنے جسم کو اچھی طرح ڈھانپ سکتی ہے۔ دوسری طرف آج کل ایسے ایسے فیشن ایبل برقعے مارکیٹ میں آنے لگے ہیں کہ ان کو پہننا دعوتِ نظارہ دینے کے مترادف ہے اور ان سے حجاب کی ضرورت کسی طرح پوری نہیں ہوتی۔

آپ کی یہ بات صحیح ہے کہ تلاشی کے دوران تنگ کیے جانے کے اندیشے سے حجاب ترک کرنا مناسب نہیں ہے۔ حجاب اختیار کرنا اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اس لیے مسلمان خاتون کو ہر حال میں اس کا التزام کرنا چاہیے۔

اسلام غیر محرم مردوں اور عورتوں کا اختلاط اور ان کا گھل مل کر رہنا گوارا نہیں کرتا۔

وہ نامحرم کے ساتھ تنہائی میں رہنے سے سختی سے منع کرتا ہے۔ آج کل اگر تعلیم گاہوں، شفاخانوں، دفتروں اور دیگر اداروں میں اختلاط سے بچنا ممکن نہیں رہ گیا ہے تو اس معاملے میں حتی الامکان احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیے اور اللہ کے رسول ﷺ کا یہ ارشاد ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھنا چاہیے:

اَلاَ لاَ یَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِاِمْرَأَةٍ اِلَّا کَانَ ثَالِثَهُمَا الشَّیْطَانُ. (جامع ترمذی، کتاب الفتن، باب ماجاء فی لزوم الجماعة، حدیث: ۲۱۶۵)

''خبردار، کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ تنہائی میں ہرگز نہ رہے، ورنہ ان کے درمیان تیسرا شیطان ہوگا۔''

آپ کے احساسات قابل مبارک باد ہیں۔ تعلیم وتبلیغ کے لیے کسی دینی مدرسہ کے سرٹیفکٹ کی ضرورت نہیں۔ کسی شخص کو دین کی، جن باتوں کا علم ہوا نہیں دوسروں تک پہنچانا ہر مومن مرد اور عورت کی ذمے داری ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَ لَوْ آیَةً. (بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب ما ذکر عن بنی اسرائیل، حدیث: ۳۴۶۱)

''میری طرف سے دوسروں تک پہنچاؤ خواہ ایک آیت ہی کیوں نہ ہو۔''

ملازمت پیشہ خواتین کا پردہ

سوال: پردہ کے بارے میں کچھ احکام سوال وجواب کی صورت میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اور سوال ذہن میں ابھرا کہ جو عورتیں ملازمت پیشہ ہیں ان کے لیے پردہ کا التزام کرنا اکثر ناممکن ہوتا ہے۔ کیوں کہ دفتروں میں ان کے کام ہی ایسے ہوتے ہیں جہاں ہر وقت ان کے لیے پردہ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ مثلاً جو خواتین پولیس میں بھرتی ہوتی ہیں ان کو چوبیس گھنٹے کھڑے کھڑے ڈیوٹی دینی پڑتی ہے؟

جواب: ذہنوں میں کچھ ایسا تصور بیٹھ گیا ہے کہ پردہ اور مروجہ برقعہ کو مترادف سمجھا جاتا ہے۔ اور جو عورت برقع نہیں اوڑھتی اسے بے پردہ کہا جاتا ہے۔ حالاں کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ شریعت نے خواتین کے لیے گھروں میں رہنے اور گھروں سے باہر نکلنے کے آداب بیان کر دیے ہیں۔ مثلاً وہ

بن ٹھن کر اور بھڑکیلے لباس پہن کر باہر نہ نکلیں، اپنی زینت کا اظہار نہ کریں، قابلِ ستر حصوں کو چھپائیں، اجنبی مردوں کے ساتھ گھلنے ملنے، ان کے ساتھ تنہائی میں رہنے اور لوچ دار آواز میں بات کرنے سے احتراز کریں، وغیرہ۔ جو عورت ان امور کا لحاظ کرتی ہے وہ شریعت کی نگاہ میں باپردہ ہے۔ چہرہ پردہ میں شامل ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں عہد صحابہ ہی سے اختلاف رہا ہے۔ بعض صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور بعد کے اہل علم بھی پردہ میں چہرہ کو شامل نہیں کرتے۔ دفتروں، اسپتالوں، اسکولوں اور دیگر اداروں میں ملازمت پیشہ خواتین شریعت کے بتائے ہوئے احکام پردہ پر عمل کرتے ہوئے اپنے کارہائے مفوضہ بہ آسانی انجام دے سکتی ہیں۔

پردہ۔ آزاد خیالی اور رواج پرستی کے درمیان

سوال: آپ نے پردہ کے تعلق سے جو اظہارِ خیال فرمایا ہے وہ قطعی غلط ہے۔ حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ تفہیم القرآن جلد چہارم میں سورۂ احزاب کی تفسیر فرماتے ہوئے مذکورہ بالا غلط تعبیر کی تردید فرماتے ہیں۔ جلد چہارم ص: ۱۲۹ پر جو سیر حاصل بحث مولانا نے فرمائی ہے اس کو پیش نظر رکھیے اور اپنا جواب ملاحظہ فرمائیے تو حقیقت کا علم ہوگا۔ پتہ نہیں، کیوں؟ جماعت اسلامی کے علما اس طرح کا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔ جماعت اسلامی کے ارکان و کارکنان ہی نہیں، بلکہ جماعت سے دور کا تعلق اور حسنِ ظن رکھنے والوں کے ہاں باستر مکمل مع چہرہ کے ڈھانپنے والے برقع کا چلن ہے، بلکہ سخت پابندی کے ساتھ ہے۔ پھر آپ کا طرزِ عمل کس طرح کے برقع کے استعمال کا ہے؟ یعنی آپ اپنے اہلِ خاندان اور اہلیہ محترمہ کو مروجہ طرز کا برقع استعمال کرواتے ہیں یا پھر اسی طرح کا، جس کا اظہار آپ نے اپنے اس جواب میں دیا ہے؟

جواب: میں نے اپنے جواب میں لکھا تھا: ''چہرہ پردہ میں شامل ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں عہد صحابہ ہی سے اختلاف رہا ہے۔ بعض صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور بعد کے اہل علم بھی پردہ میں چہرہ کو شامل نہیں کرتے۔'' ظاہر ہے، دوسرا گروہ جو امت کی تاریخ میں ہر دور میں رہا ہے، پردہ میں چہرہ کو بھی شامل کرتا ہے۔ ہر گروہ کے اپنے دلائل ہیں، جنھیں مہمل اور بے بنیاد قرار دے کر آسانی سے رد نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ چہرے کے پردے کے قائل ہیں۔ انھوں نے تفہیم القرآن جلد چہارم (سورۂ احزاب) اور جلد سوم (سورۂ نور) کی تفسیر میں اور اپنی مشہور

کتاب 'پردہ' میں تفصیل سے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے اور دلائل دیے ہیں۔ دوسرے نقطۂ نظر کے حاملین کے دلائل قدیم تفاسیر، کتبِ احکام القرآن، کتب فقہ اور بعض جدید اہل قلم کی تحریروں میں موجود ہیں۔ (ان میں سے کچھ کا تذکرہ جناب سہیل مجاہد نے اپنے مضمون شائع شدہ زندگی نومئی ۲۰۰۴ء میں کر دیا ہے) ہر شخص کو اختیار ہونا چاہیے کہ دونوں نقطہ ہائے نظر میں، جس کو صحیح سمجھتا ہو اسے اختیار کر لے۔ جماعت اسلامی کے ارکان و کارکنان اور متفقین مولانا مودودیؒ کی کسی فقہی رائے کے پابند نہیں ہیں۔

جہاں تک راقم سطور کا تعلق ہے وہ بھی چہرہ کے پردہ کا قائل ہے۔ میں نے اپنے کتابچے 'اسلامی پردہ- کیا اور کیوں؟' (شائع شدہ اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی) میں مذکورہ اختلاف کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے: ''صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جن احادیث میں چہرہ اور ہاتھ کھلا رہنے کی اجازت دی گئی ہے ان کا تعلق عورت کے ستر سے ہے نہ کہ حجاب سے، یعنی عورت چہرہ اور ہاتھ کے علاوہ اپنا پورا جسم شوہر کے علاوہ تمام لوگوں سے چھپائے گی، خواہ وہ قریب ترین رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ رہے نامحرم مرد تو ان کے سامنے وہ چہرہ اور ہاتھ بھی بلاضرورت نہیں کھولے گی۔'' (ص:۳۹) لیکن جو لوگ چہرہ کے پردے کے قائل نہیں یا اس کا پردہ نہیں کرتے میں انھیں دین سے بے بہرہ اور مغربی تہذیب سے متاثر نہیں کہتا، اس لیے کہ مآخذ شریعت میں اس کی بنیادیں موجود ہیں۔

پردہ کے سلسلے میں، جو معتدل رویہ مطلوب ہے اس کی وضاحت محترم پروفیسر خورشید احمد مدیر ماہ نامہ ترجمان القرآن لاہور کے ایک جواب سے ہوتی ہے۔ انھوں نے اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں مذکورہ ماہ نامہ کے فروری ۲۰۰۳ء کے شمارہ میں لکھا تھا: ''میرا اپنا تعامل ان علماء کی رائے کے مطابق ہے، جو چہرے کے حجاب کے قائل ہیں، لیکن یہ زیادتی ہوگی کہ جو لوگ اپنے دلائل کے مطابق اپنے چہرے کے حجاب کے قائل نہیں ہیں انھیں اس زمرے میں ڈال دیا جائے، جو بے پردگی اور مغربی ثقافت و بے حجابی کے قائل ہیں۔ ہمیں جہاں اس راستے کو اختیار کرنا چاہیے اور اسی پر استقامت کا ثبوت دینا چاہیے، جسے ہم شرعی دلائل یا معتبر علماء کی رائے کے احترام کی بنیاد پر اختیار کرتے ہیں اور بجا طور پر اس پر ہمیں اطمینان اور فخر ہونا چاہیے اور اللہ تعالیٰ

سے اجرا اور قبولیت کی توقع رکھنی چاہیے، وہیں اگر دوسرا نقطۂ نظر کچھ ایسے دلائل کی بنیاد پر ہے، جو خواہ ہمیں مطمئن نہ کر سکے لیکن جس کی نسبت شریعت کے ماخذ ہی کی طرف ہو تو ہمیں اس کا بھی احترام کرنا چاہیے۔ یہ اسی طرح ہے، جس طرح فقہ کے مختلف مکاتب فکر میں اختلاف پایا جاتا ہے۔'' (ص:۹۴-۹۵)

جن لوگوں کے نزدیک پردہ کے تقاضے مروجہ برقع ہی سے پورے ہو سکتے ہیں، انھیں اس سوال کا جواب دینا چاہیے کہ کیا اس کے رواج سے قبل عورتیں شریعت کی نگاہ میں بے پردہ رہتی تھیں؟

خواتین اور زیارتِ قبور

سوال: عورتوں کے قبرستان جانے کا کیا حکم ہے؟ عموماً لوگ انھیں قبرستان جانے سے روکتے ہیں۔ بعض حضرات حرام قرار دیتے ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے زیارتِ قبور کی ترغیب دی ہے اور فرمایا ہے کہ اس سے دلوں میں رقت پیدا ہوتی اور آخرت کی یاد آتی ہے۔ تو اس سے عورتوں کو کیوں محروم رکھا جائے؟ بہ راہ کرم احادیثِ نبوی کی روشنی میں وضاحت فرمائیں کہ کیا عورتوں کے لیے قبرستان جانے کی بالکلیہ ممانعت ہے؟

جواب: ابتدا میں آں حضرت ﷺ نے اپنے اصحاب کو زیارتِ قبور سے مطلق منع فرما دیا تھا۔ اس لیے کہ ان کا جاہلیت کا زمانہ قریب تھا۔ اس بنا پر ان کے شرک و بدعات میں مبتلا ہونے کا اندیشہ تھا۔ لیکن جب انھوں نے دین کو اچھی طرح سمجھ لیا اور توحید اور شرک و بدعات کے حدود سے خوب واقف ہو گئے تو آپ نے انھیں اس کی اجازت دے دی۔ حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ، فَزُوْرُوْهَا.

(صحيح مسلم، كتاب الجنائز، حديث: ۹۷۷، سنن ابی داؤد كتاب الجنائز، باب فی زيارة القبور، حديث: ۳۲۳۵، جامع ترمذی، ابواب الجنائز، باب ماجاء فی الرخصة فی زيارة القبور، حديث: ۱۰۵٤، سنن النسائی، كتاب الجنائز، باب زيارة القبور، حديث: ۲۰۳۲)

''میں نے پہلے تم لوگوں کو زیارت قبور سے روکا تھا، اب تم ایسا کر سکتے ہو۔''

ترمذی کی روایت میں ہے کہ ساتھ ہی آپؐ نے یہ بھی فرمایا:

فَاِنَّهَا تُذَكِّرُكُمُ الْآخِرَةَ.

''اس لیے کہ زیارتِ قبور سے آخرت کی یاد تازہ ہوگی۔''

حدیثِ بالا کا خطاب عام ہے۔ اس میں مرد و عورت کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ لیکن بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت محمد ﷺ نے عورتوں کو زیارتِ قبور سے روکا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ لَعَنَ زَائِرَاتِ الْقُبُوْرِ.

(سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، باب فی زیارة النساء للقبور، حدیث: ۳۲۳۶، جامع ترمذی، ابواب الصلاة، باب ماجاء فی کراهیة ان یتخذ علی القبر مسجداً، حدیث: ۳۲۰، سنن النسائی، کتاب الجنائز، باب التغلیظ فی اتخاذ السرج علی القبور، حدیث: ۲۰۴۳)

''اللہ کے رسول ﷺ نے زیارتِ قبور کے لیے جانے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔''

ترمذی کی ایک دوسری روایت میں جو حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، زائرات کی جگہ 'زوّارات' (یعنی کثرت سے زیارتِ قبور کے لیے جانے والی عورتیں) کا لفظ ہے۔ (کتاب الجنائز، باب ماجاء فی کراهیة زیارة القبور للنساء، حدیث: ۱۰۵۶)

عورتوں سے متعلق ان احادیث کی وجہ سے بعض علماء نے ان کے لیے زیارتِ قبور کو مکروہ قرار دیا ہے۔ لیکن بعض دیگر علماء مردوں کی طرح عورتوں کے لیے بھی زیارتِ قبور کی اجازت دیتے ہیں۔ (ملاحظہ کیجیے الموسوعۃ الفقہیۃ، ۲۴/۸۸) ان کا استدلال درج ذیل احادیث سے ہے:

(۱) حضرت عبداللہ بن ابی ملیکہؒ فرماتے ہیں کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ ایک مرتبہ قبرستان سے واپس آئیں۔ میں نے عرض کیا: اے ام المومنین، آپ کہاں سے تشریف لا رہی ہیں؟ فرمایا: اپنے بھائی عبدالرحمٰن کی قبر کے پاس سے۔ میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ

نے تو زیارتِ قبور سے منع کیا ہے۔ فرمایا: ہاں پہلے آپؐ نے منع کیا تھا، لیکن بعد میں اس کی اجازت دے دی تھی۔ اس روایت کو حاکم اور بیہقی نے روایت کیا ہے اور ذہبی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

(۲) ام المومنین حضرت عائشہؓ سے ایک طویل حدیث مروی ہے، جس کے آخر میں ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا: میں قبرستان جاؤں تو وہاں کیا کہوں؟ آں حضرت ﷺ نے انھیں دعا سکھائی۔ (صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب ما یقال عند دخول المقابر، حدیث: ۲۷٤، سنن النسائی کتاب الجنائز، باب الامر بالاستغفار للمومنین، حدیث: ۲۰۳۷)

(۳) حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک عورت اپنے بچے کی قبر پر بیٹھی رو رہی تھی۔ وہاں سے اللہ کے رسول ﷺ گزرے تو آپؐ نے فرمایا: ''اللہ سے ڈرو اور صبر کرو۔'' اس نے کہا: آپ کو میری مصیبت کا کیا اندازہ! بعد میں اس عورت کو بتایا گیا کہ یہ اللہ کے رسول ﷺ تھے تو وہ بہت گھبرائی۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور معذرت کرنے لگی کہ میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا۔ آپؐ نے فرمایا:

اِنَّمَا الصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْاُوْلٰی. (صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب زیارة القبور، حدیث: ۱۲۸۳، صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب فی الصبر علی المصیبة عند الصدمة الاولی، حدیث: ۹۲٦)

''صبر تو حادثہ کے وقت قوتِ برداشت کا نام ہے۔''

علامہ ابن تیمیہؒ نے اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے۔ انھوں نے علماء کے اختلافات ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بعض علماء کے نزدیک عورتوں کے لیے زیارتِ قبور کی اجازت ہے۔ لیکن خود ابن تیمیہؒ نے اپنا نقطۂ نظر اس کے برخلاف پیش کیا ہے اور اس کے دلائل دیے ہیں۔

(ملاحظہ کیجیے فتاویٰ ابن تیمیہ، ۲۴/۳۴۳-۳۵٦)

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں: ''حدیث میں زیارتِ قبور کرنے والی، جن عورتوں پر لعنت بھیجی گئی ہے ان سے مراد وہ عورتیں ہیں، جو کثرت سے ایسا کرتی ہیں۔ اس لیے کہ اس سے

حقوقِ زوجیت کی پامالی، بے پردگی، رونا پیٹنا اور دیگر مفاسد پیدا ہوتے ہیں۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہ مفاسد نہ ہوں تو عورتوں کے لیے زیارتِ قبور کی اجازت میں کوئی مانع نہیں ہے۔ اس لیے کہ زیارتِ قبور کا ایک فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ اس سے موت کی یاد تازہ ہوتی ہے اور اس کی مردوں اور عورتوں دونوں کو ضرورت ہے۔''

علامہ شوکانیؒ علامہ قرطبیؒ کی اس تشریح و تطبیق پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''عورتوں کے لیے زیارتِ قبور کے موضوع پر بہ ظاہر متعارض احادیث کے درمیان اس انداز سے جمع و تطبیق مناسب ہے۔'' (ملاحظہ کیجیے فقه السنة، السيد سابق، ۱/۵۶۶-۵۶۷)

اس تفصیل سے واضح ہے کہ عبرت و موعظت، رقت قلب، موت اور آخرت کی یاد دہانی کے مقصد سے خواتین کبھی کبھی قبرستان جا سکتی ہیں۔ البتہ جنازہ کے ساتھ ان کا قبرستان جانا ممنوع ہے۔ حضرت ام عطیہؓ فرماتی ہیں:

نُهِينَا عَنِ اتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ، وَلَمْ يُعْزَمْ عَلَيْنَا. (صحيح بخاری، كتاب الجنائز، باب اتباع النساء الجنازة، حديث: ۱۲۷۸، صحيح مسلم كتاب الجنائز، باب نهى النساء عن اتباع الجنائز، حديث: ۹۳۸)

''ہمیں جنازہ کے ساتھ جانے سے منع کیا گیا ہے لیکن اس معاملے میں سختی نہیں کی گئی ہے۔''

اس سلسلے میں فیصلہ کن بات وہ ہے، جو علامہ ابن تیمیہؒ نے فقہاء کے حوالے سے کہی ہے کہ ''اگر کسی عورت کو اپنے بارے میں یہ اندیشہ ہو کہ اگر وہ قبرستان جائے گی تو اس کے منہ سے غلط باتیں یا غلط حرکتیں سرزد ہو سکتی ہیں تو اس کا قبرستان جانا بلا اختلاف ناجائز ہے۔''

(فتاویٰ ابن تیمیہ، ۳۴/۳۵۶)

اولاد کے درمیان مال و جائیداد کی منصفانہ تقسیم

سوال: درج ذیل مسئلے میں شریعت کی روشنی میں مشورہ درکار ہے:

میرے چھ لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ اہلیہ کا انتقال بارہ سال قبل ہو چکا ہے۔ تمام

بچوں کی شادیاں ہوچکی ہیں۔لڑکیاں اپنے اپنے گھروں میں ہیں۔لڑکوں میں سے ہر ایک کی شادی کر کے میں نے اس کے لیے الگ رہائش فراہم کردی، جس میں وہ اپنی فیملی کے ساتھ رہ رہا ہے۔ان کے لیے الگ الگ رہائش فراہم کرنے میں آراضی کی خریداری اور مکان کی تعمیر میں، جو سرمایہ لگا اس میں سے کچھ میرا اور کچھ لڑکوں کا کمایا ہوا تھا۔ظاہر ہے لڑکوں کا فراہم کردہ سرمایہ برابر نہیں تھا۔ ہر ایک نے حسبِ توفیق سرمایہ فراہم کیا، بعض نے کچھ بھی نہیں کیا۔چھوٹے لڑکے کے لیے مکان کی تعمیر میں اس کے بھائیوں نے بھی مدد کی۔لڑکوں نے باہمی رضامندی سے یہ تقسیم منظور کرلی ہے۔اب میرے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ تینوں لڑکیوں کا کیا ہو؟ ان کے حصے میں تو کچھ نہیں آیا۔اگر آنا چاہیے تو کیا اور کس طرح؟ واضح رہے کہ میری تھوڑی سی آبائی جائیداد وطن میں ہے، جو میرے بھائی کی تحویل میں ہے۔ابھی اس کی تقسیم عمل میں نہیں آئی ہے۔

مسئلہ تقسیمِ وراثت کا نہیں ہے، بلکہ باہمی رضامندی سے تقسیم اور منصفانہ تقسیم کا ہے، تاکہ بعد میں ان میں کوئی نزاع نہ پیدا ہو۔آپ سے گزارش ہے کہ اس مسئلہ میں اپنے مفید مشورے سے نوازیں۔اللہ کا شکر ہے کہ میرے تمام لڑکے اور ان کی فیملی میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔

جواب: اولاد سے محبت کا جذبہ فطری طور پر ہر انسان کے دل میں ودیعت کیا گیا ہے۔اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے بچے پھلیں پھولیں، حالاتِ زمانہ کی انھیں ہوا نہ لگے، وہ خوب ترقی کریں اور عیش و آرام سے رہیں۔ بچے چھوٹے ہوں تو ان کی کفالت اور نفقہ باپ کے ذمے لازم کیا گیا ہے۔لڑکا بالغ ہوجائے اور لڑکی کی شادی ہوجائے تو وجوب ختم ہوجاتا ہے، لیکن اس کے بعد بھی وقتِ ضرورت ان کی مدد کرنا، انھیں سہارا دینا اور انھیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں تعاون کرنا شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے انھیں خوب مال و دولت سے نوازا تھا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر مکہ میں شدید بیمار ہوگئے، یہاں تک کہ جاں بر ہونے کی امید نہ رہی۔اللہ کے رسول ﷺ عیادت کے لیے تشریف لائے تو عرض کیا: اللہ کے رسولؐ! میں بہت مال دار ہوں، میرے ورثاء بھی زیادہ نہیں، جنھیں مال کی ضرورت ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے دو تہائی مال کی وصیت کر جاؤں (ایک روایت میں ہے کہ انھوں نے اپنا پورا مال وصیت

کرنے کی اجازت مانگی تھی)۔ آں حضرت ﷺ نے فرمایا: نہیں! عرض کیا: نصف مال کی وصیت کردوں؟ فرمایا نہیں، عرض کیا: اچھا، ایک تہائی مال کی؟ فرمایا: ہاں، ایک تہائی بہت ہے۔ پھر آپؐ نے مزید فرمایا:

اِنَّکَ اَنْ تَذَرَ وَرَثَتَکَ اَغْنِیَاءَ خَیْرٌ مِّنْ اَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً یَتَکَفَّفُوْنَ النَّاسَ. (صحیح بخاری، کتاب الجنائز، حدیث: ۱۲۹۵، کتاب الوصایا، حدیث: ۲۷۴۲، صحیح مسلم، حدیث: ۱۶۲۸)

''تم اپنے ورثاء کو مال دار چھوڑ جاؤ یہ اس سے بہتر ہے کہ تم انھیں اس حال میں چھوڑو کہ وہ غریب اور دوسروں کے محتاج ہوں۔''

اس حدیث سے فقہاء نے یہ استنباط کیا ہے کہ آدمی مرض وفات میں اپنے مال کے ایک تہائی حصے سے زیادہ کی وصیت نہیں کرسکتا، بہ الفاظ دیگر مرض وفات سے قبل اپنی زندگی میں وہ اپنے مال میں سے، جس کو جتنا چاہے دے سکتا ہے۔ اس معاملے میں ورثاء اور غیر ورثاء کی کوئی تفریق نہیں ہے۔

مشترکہ خاندانی نظام میں گھر کے مصارف اٹھانے میں تمام افراد کا حصہ ہوتا ہے، کچھ باہر کما کر رقم بھیجتے ہیں، کچھ گھر کے معاملات دیکھتے ہیں۔ خاندان کا سربراہ نگرانی رکھتا، معاملات کی تنظیم کرتا اور حسبِ ضرورت خرچ کرتا ہے۔ اس لیے اس عرصے میں کسی فرد کی کمائی کو اس کے لیے خاص نہیں قرار دیا جاسکتا۔ الّا یہ کہ وہ رقم بھیجتے وقت اس کی صراحت کردے اور اپنے لیے کسی مخصوص کام میں خرچ کرنے کی ہدایت کرے۔

کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنا مال جائیداد اپنی اولاد، رشتہ داروں یا دیگر متعلقین میں تقسیم کرنا چاہتا ہے تو وہ ایسا کرسکتا ہے۔ اسے اختیار ہے، جس کو جتنا چاہے دے دے، لیکن اس معاملے میں بہتر ہے کہ وہ منصفانہ تقسیم پیشِ نظر رکھے، تاکہ مستحقین کی حق تلفی نہ ہو اور شکایتیں اور تلخیاں نہ پیدا ہوں۔

حضرت نعمان بن بشیرؓ فرماتے ہیں: میری والدہ نے میرے لیے میرے والد سے

سفارش کی کہ اسے کوئی عطیہ دیجیے۔ میرے والد اس پر آمادہ ہوئے۔ (بعض روایات میں ہے کہ) انھوں نے مجھے ایک غلام دینے کا ارادہ کیا تو میری والدہ نے تاکید کی کہ پہلے رسول اللہ ﷺ کے سامنے یہ معاملہ رکھ کر آپؐ کی تائید لے لیجیے۔ میرے والد مجھے اپنے ساتھ لے کر بارگاہِ نبویؐ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ﷺ میں نے اپنے اس بیٹے کو ایک غلام دیا ہے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا: کیا تم نے اپنے تمام بیٹوں کو اسی طرح غلام دیا ہے۔ عرض کیا: نہیں، آں حضرت ﷺ نے فرمایا: تو اس کو بھی نہ دو۔ ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْدِلُوْا بَيْنَ اَوْلَادِكُمْ.

''اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان انصاف کا معاملہ کرو۔''

دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں:

اِعْدِلُوْا بَيْنَ اَوْلَادِكُمْ فِي الْعَطِيَّةِ.

''اپنی اولاد کے درمیان عطیہ تقسیم کرنے میں انصاف سے کام لو۔''

ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: لَا تُشْهِدْنِيْ عَلٰى جَوْرٍ۔ یعنی مجھ سے یہ امید نہ رکھو کہ میں کسی غلط اور غیر منصفانہ کام کی توثیق کروں گا۔

(صحیح بخاری، کتاب الھبة، باب الھبة للولد، حدیث: ۲۵۸۶، باب الاشھاد فی الھبة، حدیث: ۲۵۸۷، کتاب الشھادات، باب لایشھد علی شھادة جور اذا اشھد، حدیث: ۲۶۵۰)

صحیح مسلم کی روایت میں آں حضرت ﷺ نے اس کی حکمت بھی بیان کی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

اَيَسُرُّكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا اِلَيْكَ فِي الْبِرِّ سَوَاءً.

''کیا تم کو اس سے خوشی نہ ہوگی کہ تمھارے تمام لڑکے یکساں طور پر تمھارے ساتھ حسنِ سلوک کریں؟''

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

اَلَيْسَ تُرِيْدُ مِنْهُمُ الْبِرَّ مِثْلَ مَا تُرِيْدُ مِنْ ذَا؟

''کیا تم نہیں چاہتے کہ تمھارے دوسرے لڑکے بھی تمھارے ساتھ اسی طرح حسنِ سلوک کریں جس طرح یہ لڑکا کرے؟''

صحابیِ مذکور نے جواب دیا: ہاں کیوں نہیں؟ تو آپؐ نے فرمایا: پھر ایسا نہ کرو کہ ایک کو دو اور دوسروں کو نہ دو۔'' (صحیح مسلم، کتاب الهبات، باب کراهة تفضیل بعض الأولاد فی الهبة، حدیث: ۱۶۲۳)

شریعت کی نگاہ میں جس طرح لڑکوں کے درمیان تفریق مناسب نہیں ہے، اسی طرح صرف لڑکوں کو نوازنا اور لڑکیوں کو محروم رکھنا بھی درست نہیں ہے۔ حسب ضرورت اور حسبِ توفیق لڑکیوں کا بھی ضرور حصہ لگانا چاہیے اور جس طرح وراثت میں باہمی رضامندی سے لڑکیوں کو غیر منقولہ جائیداد کے بدلے معاوضہ دیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اس زیر بحث صورت میں بھی کیا جاسکتا ہے۔

آدمی کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ایسے سعادت مند بچے ملے ہوں، جو اس کے بڑھاپے کا سہارا بنیں، اس کے ساتھ ہر طرح کے حسنِ سلوک سے پیش آئیں، اس سے جو کچھ ملے اس پر راضی ہوں اور وہ انھیں خوش وخرم، باہم شیر وشکر اور پھلتا پھولتا دیکھتا ہوا اس دنیا سے رخصت ہو۔

رشتے داروں کے ساتھ حسنِ سلوک

سوال: ہمارے بعض رشتے دار کالا جادو کرتے ہیں۔ کیا یہ مناسب ہوگا کہ ان سے تعلقات باقی رکھے جائیں؟ یا ان سے بالکلیہ قطع تعلق کر لینا چاہیے؟

جواب: رشتے دار بعض معصیتوں میں مبتلا ہوں تو ان سے مکمل قطع تعلق کر لینا مناسب نہیں ہے۔ بلکہ تعلقات باقی رکھتے ہوئے ان کی اصلاح کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ کفر سے بڑھ کر اور کیا معصیت ہوسکتی ہے۔ لیکن قرآن صراحت کرتا ہے کہ کسی کے ماں باپ کافر ہوں اور وہ اپنے بیٹے کو بھی شرکیہ اعمال میں مبتلا کرنے کی کوشش کریں تو بیٹے کو چاہیے کہ ان کی یہ بات تو نہ مانے، لیکن ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرتا رہے۔ سورۂ لقمان میں ہے:

وَ اِنْ جٰهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا (لقمان:۱۵)

''اور اگر وہ (والدین) تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے، جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان۔ دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ۔''

اگر کسی رشتے دار کے ذرائع آمدنی میں متعین طور پر حرام کا غلبہ ہو تو اس کے یہاں کھانے پینے، یا اس کے تحائف قبول کرنے سے احتراز کرنا چاہیے، لیکن دیگر معاملات میں اس سے تعلقات استوار رکھتے ہوئے اصلاحِ احوال کی کوشش جاری رکھنی چاہیے۔

داڑھی کی اہمیت اور اس کی مقدار کا مسئلہ

سوال: میں پہلے داڑھی نہیں رکھتا تھا۔ کچھ ملّا لوگ کافی اعتراض کرتے تھے۔ اب میں نے خشخشی داڑھی رکھ لی ہے۔ مگر کچھ ملّا لوگ اب بھی پریشان کرتے رہتے ہیں کہ یا تو اسے صاف کراؤ یا بڑھاؤ۔ جب کہ میرے علم میں پیائش کے بارے میں کوئی حدیث بھی نہیں ہے اور نہ حضرت محمد ﷺ کی بعثت کا یہ مقصد تھا کہ کچھ لوگ داڑھی نہیں رکھ رہے تھے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو داڑھی رکھوانے کے لیے مبعوث کیا ہو۔ لوگ اصل دین کو چھوڑ کر ایسی باتوں میں الجھا دیتے ہیں۔ داڑھی رکھتے ہیں مگر زندگی غیر اسلامی طریقوں پر گزرتی ہے۔ بہ راہ کرم آپ اس مسئلے پر تفصیل سے قرآن وحدیث کی روشنی میں بتائیں کہ کتنی پیائش کی داڑھی رکھی جائے؟ اگر کوئی داڑھی نہیں رکھتا تو کیا اس کا داخلہ جنت میں نہ ہو سکے گا؟

جواب: داڑھی کے سلسلے میں صحیح حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

جُزُّوا الشَّوَارِبَ وَاَرْخُوا اللُّحٰی، خَالِفُوا الْمَجُوْسَ.

(صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب خصال الفطرة، حدیث: ٢٦٠)

''مونچھیں کاٹو اور داڑھیاں لمبی کرو (اس طرح) مجوس کی مخالفت کرو۔''

یہی حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

خَالِفُوا الْمُشْرِكِيْنَ وَ وَفِّرُوْا اللُّحٰی وَاَحْفُوا الشَّوَارِبَ

(صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب تقلیم الاظفار، حدیث: ۵۸۹۲۔ یہ حدیث دیگر کتب احادیث میں بھی مروی ہے)

''مشرکین کی مخالفت کرو، داڑھیاں بڑھاؤ اور مونچھیں صاف کرو۔''

ان احادیث سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) داڑھی کے معاملے میں صحیح مسلم کی حدیث میں مجوس اور صحیح بخاری کی حدیث میں مشرکین کی مخالفت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ بات تمام محدثین نے لکھی ہے کہ اس زمانے میں مجوس عام طور پر داڑھیاں چھوٹی کراتے تھے، البتہ کچھ لوگ منڈاتے بھی تھے۔ ممکن ہے انھیں دیکھ کر مشرکین بھی داڑھیاں چھوٹی کرانے اور منڈانے لگے ہوں۔ مخالفت کے حکم کا لازمی تقاضا ہے کہ داڑھیاں مجوس سے بڑی رکھی جائیں۔

(۲) مسلم کی حدیث میں ''اَرْخُوا'' اور بخاری کی حدیث میں ''وَفِّرُوا'' کے الفاظ ہیں۔ بعض دیگر احادیث میں اُعْفُوا، اَوْفُوا اور اَرْجُوا کے الفاظ آئے ہیں۔ ان تمام الفاظ کے معنی ایک ہیں یعنی لمبا کرنا اور بڑھانا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محض تشخی داڑھی رکھ لینے سے ان احادیث کا منشا پورا نہیں ہوسکتا۔

(۳) اسلام زندگی کے تمام معاملات میں اپنے ماننے والوں کا ایک تشخص قائم رکھنا چاہتا ہے۔ ان احادیث میں داڑھی رکھنے کا تاکیدی حکم اسی پس منظر میں ہے۔ اس لیے داڑھی کو عادت اور رواج کے قبیل سے نہیں لینا چاہیے۔ بلکہ اسے اسلامی معاشرہ کے ایک شعار اور اسلامی تہذیب کے ایک نشان کی حیثیت دینی چاہیے۔

(۴) اس حدیث میں اور اس مضمون کی دیگر احادیث میں داڑھی کی کوئی مقدار نہیں بیان کی گئی ہے کہ کم از کم کتنی لمبی رکھی جائے۔ اس کا علم رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام کے عمل سے ہوتا ہے۔ احادیث میں ہے کہ آں حضرت ﷺ کی ریش مبارک بڑی اور گھنی تھی اور وہ آپ ﷺ کے سینے کو ڈھکے رہتی تھی۔ یہی بات صحابہ کرامؓ اور بالخصوص خلفائے راشدین کی داڑھیوں کے بارے میں بھی ملتی ہے۔ اس بنا پر فقہاء نے داڑھی چھوٹی کروانے اور کٹوانے کو ممنوع قرار دیا ہے۔

بعض فقہاء اس بات کے قائل ہیں کہ داڑھی جب ایک مشت سے زائد ہو جائے تو زائد حصہ کٹوایا جاسکتا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ جب حج یا عمرہ کرتے تو اپنی داڑھی کو مٹھی میں لیتے اور جو حصہ اس سے زائد ہوتا اسے کٹوا

دیتے تھے۔ (صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب تقلیم الاظفار، حدیث: ۵۸۹۲) حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت جابرؓ سے بھی یہی مروی ہے۔ (فتح الباری، ۱۰/۳۵۰)

بہ ہر حال کسی فقیہ نے ایک مشت سے کم داڑھی ہونے کی صورت میں اسے کٹوانے کو جائز نہیں قرار دیا ہے۔

داڑھی کے مسئلے میں غور کرتے وقت ایک چیز کا خیال رکھنا چاہیے۔ وہ یہ کہ داڑھی کی مقدار کو کسی شخص کی دین داری اور تقویٰ ناپنے کا پیمانہ نہیں بنانا چاہیے۔ داڑھی رکھنا سنت مؤکدہ اور اسلامی شعار ہے۔ لیکن اگر اس معاملے میں کوئی شخص کوتاہ ہے تو اسے بے دین اور فاسق قرار دینے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ آج سے چالیس سال قبل ماہ نامہ زندگی کے اپریل ۱۹۶۳ کے شمارے میں مولانا سید احمد عروج قادری کا ایک تحقیقی اور مدلل مضمون اس موضوع پر شائع ہوا تھا۔ مضمون کے آخر میں انھوں نے بہ طور خلاصہ بڑی متوازن بات لکھی تھی کہ ''چوں کہ مغربی تہذیب کے استیلاء نے مسلمان معاشرے میں بھی حلقِ لحیہ (داڑھی منڈانے) کی وبا پھیلا دی ہے، اس لیے حلق لحیہ ترک کر کے ایک ذرا سی داڑھی بھی رکھ لینا بڑا کام ہے اور ایسے شخص کا جذبۂ دینی قابل قدر ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ اس نے ارشاد نبویؐ کا منشا پورا کر دیا، صحیح نہیں ہے۔ ایسے شخص کا عمل ناقص ہے۔ اسے اپنے آپ کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہیے کہ اس کا یہ عمل سنت نبوی کے مطابق ہو جائے۔''

آخر میں تین باتوں کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں:

(۱) آپ کے سوال میں 'ملّا لوگ' کے الفاظ میں، جو طنز پوشیدہ ہے اسے بہ خوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ دین کے حوالے سے اگر کوئی شخص کوئی بات بتائے اور کسی چیز کے سلسلے میں اللہ اور رسول ﷺ کے احکام کی جانب توجہ دلائے تو 'ملّا' کہہ کر اس کی بات کو ہوا میں اڑا دینا مناسب نہیں ہے۔ بلکہ قرین عقل و دانش یہ ہے کہ ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے کہ اس کی بات صحیح ہے یا نہیں؟ اور اگر دلائل کی روشنی میں صحیح نکلے تو اس پر عمل کرنے کے لیے خود کو آمادہ کرنا چاہیے۔

(۲) دین میں جس چیز کا جو مقام ہے اسے وہی مقام دینا چاہیے۔ نفل و مستحب کو واجب اور فرض بنا لینا اور فرائض سے غفلت برتنا، جزئیات و فروع کو اصولِ دین کی حیثیت دینا اور اصول دین

کونظر انداز کرنا صحیح رویّہ نہیں ہے، لیکن ایک سچے مسلمان کے لیے اللہ کے رسول ﷺ سے محبت اور عقیدت کا مظہر یہ ہے کہ آپ ﷺ کا جو حکم بھی سامنے آئے اور وہ صحیح احادیث سے ثابت ہو، اس پر خوش دلی سے عمل کرنے کی کوشش کرے۔

(۳) ہر شخص اس دنیا میں جو بھی اچھا کام کرے گا، آخرت میں اس کا اجر پائے گا اور جو بھی برا کام کرے گا اس کی اسے سزا ملے گی۔ اگر کسی نے اپنی زندگی میں دو ایک اچھے کام کیے ہیں، لیکن پوری زندگی غلط کاموں میں گزاری ہو تو آخرت میں اسے غلط کاموں کی سزا ملے گی اور ان دو ایک اچھے کاموں کا اجر دیا جائے گا۔ اس لیے کسی شخص کے زیادہ غلط کاموں کی بنا پر اس کے بعض اچھے کاموں کو بھی نا قابل اعتبار قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین پر چلنے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکموں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

نذر کی شرعی حیثیت

سوال: بعض لوگ نذر مانتے ہیں کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو میں اتنی رکعت شکرانہ نماز ادا کروں گا یا اتنی رقم خیرات کردوں گا؟ یہ تو اللہ تعالیٰ سے سودے بازی معلوم ہوتی ہے۔ کیا اس طرح نذر ماننی درست ہے؟ براہِ کرم نذر کی شرعی حیثیت سے آگاہ فرمائیے۔

جواب: نذر کا مطلب یہ ہے کہ انسان کسی چیز کو، جو اس پر لازم نہ ہو، اپنے اوپر لازم کرلے۔ قرآن وسنت میں نذر کو پورا کرنے کی تاکید کی گئی ہے اور اسے نیک لوگوں کا ایک وصف قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ حج میں ہے: وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ (آیت:۲۹) ''اور اپنی نذریں پوری کریں۔'' سورۂ دہر میں جنت کے مستحق اللہ کے نیک بندوں کے، جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں ان میں یہ بھی ہے: يُوفُونَ بِالنَّذْرِ آیت:۷، (وہ نذر پوری کرتے ہیں) اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ نَذَرَ اَنْ يُّطِيعَ اللّٰهَ فَلْيُطِعْهُ.

(صحيح بخارى، كتاب الأيمان والنذور، باب النذر فى الطاعة، حديث: ٦٦٩٦)

''جس نے اللہ کی اطاعت کے کسی کام کی نذر مانی اسے چاہیے کہ اسے پورا کرے۔''

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نذر ماننا مستحب اور افضل عمل ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اللہ کے رسول ﷺ اور اکابرِ صحابہ نے ایسا ضرور کیا ہوتا، لیکن ان سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

بعض لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ نذر ماننے سے، جس چیز کے لیے نذر مانی جائے، وہ جلد پوری ہو جاتی ہے۔ یا اللہ تعالیٰ اس نذر کی وجہ سے وہ کام کر دیتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر نذر سے تقدیر بدلی جا سکتی ہے۔ اس اعتقاد کے ساتھ نذر ماننے سے اللہ کے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں۔ نبی ﷺ نے نذر ماننے سے منع کیا ہے اور ارشاد فرمایا ہے:

اِنَّهُ لاَ يَرُدُّ شَيْئًا وَ اِنَّمَا يُسْتَخْرَجُ مِنَ الْبَخِيْلِ. (صحيح بخارى، كتاب القدر، باب القاء النذر العبد الى القدر، حديث: ٦٦٠٨، صحيح مسلم، كتاب النذر، باب النهى عن النذر، حديث: ١٦٣٩)

''جو کچھ انسان کی تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے، نذر سے اس کو بدلا نہیں جا سکتا۔ البتہ نذر کے ذریعے بخیل (کی جیب) سے کچھ نکل آتا ہے۔''

عہد نبوی میں لوگ طرح طرح کی نذریں مانا کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ نذریں طاعت کے قبیل سے ہوتی تھیں، کچھ معصیت کی ہوتی تھیں اور کچھ نفس انسانی کے لیے شاق گزرتی تھیں۔ آپؐ نے معصیت کی نذروں پر عمل سے روکا۔ تقربِ الٰہی کے کاموں پر مشتمل نذروں کو پورا کرنے کی اجازت دی، البتہ ان میں سے جو نفسِ انسانی کے لیے شاق تھیں ان کے بارے میں صراحت فرما دی کہ ان پر من وعن عمل کرنا ضروری نہیں ہے۔ عہد نبوی کے درج ذیل واقعات سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ فتحِ مکہ کے موقع پر ایک شخص نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ میں نے نذر مانی تھی کہ مکہ فتح ہوگا تو میں بیت المقدس جا کر دو رکعت نماز ادا کروں گا۔ حضورؐ نے فرمایا: یہیں پڑھ لو۔ اس نے کہا: لیکن میں نے تو بیت المقدس جا کر نماز ادا کرنے کی نذر مانی تھی۔ آپؐ نے پھر فرمایا: یہیں پڑھ لو۔ اس نے پھر اپنی بات دہرائی تو آپؐ

نے فرمایا: تو جاؤ، دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے اس شخص سے فرمایا: تمھارے یہاں نماز ادا کر لینے سے بیت المقدس میں نماز ادا کرنے کی نذر پوری جائے گی۔

(سنن ابی داؤد، کتاب الأیمان والنذور، باب من نذر ان یصلی فی بیت المقدس، حدیث: ۳۳۰۵، ۳۳۰۶)

حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ایک بوڑھے شخص کو دیکھا، جو اپنے بیٹوں کے کندھوں پر جھولتا ہوا چل رہا تھا۔ دریافت فرمایا: اسے کیا ہو گیا ہے؟ لوگوں نے بتایا: اس نے پیدل (حج کے لیے) جانے کی نذر مانی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ عَنْ تَعْذِیْبِ هٰذَا نَفْسَهُ. (صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، باب النذر فیما لا یملك و فی معصیة، حدیث: ٦٧٠١، کتب جزاء الصید، باب من نذر المشی الی الکعبة، حدیث: ١٨٦٥، صحیح مسلم، کتاب النذر، باب من نذر ان یمشی الی الکعبة حدیث: ١٦٤٢، یہ حدیث دیگر کتب حدیث میں بھی مروی ہے)

''اللہ تعالیٰ اس سے بے نیاز ہے کہ یہ شخص اپنے آپ کو تکلیف دے۔''

آپؐ نے اسے سواری استعمال کرنے کا حکم دیا۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک موقع پر آں حضرت ﷺ خطبہ دے رہے تھے۔ آپؐ نے ایک شخص کو مستقل کھڑا ہوا دیکھا۔ اس کے بارے میں دریافت کیا تو پتا چلا کہ اس نے نذر مانی ہے کہ مستقل کھڑا رہے گا۔ نہ بیٹھے گا، نہ سایے میں رہے گا، نہ کسی سے بات کرے گا اور اسی حالت میں روزہ رکھے گا۔ آپؐ نے فرمایا:

مُرْهُ فَلْیَتَکَلَّمْ وَلْیَسْتَظِلَّ وَلْیَقْعُدْ، وَلْیُتِمَّ صَوْمَهُ. (صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، باب النذر فیما لا یملك و فی معصیة، حدیث: ٦٠٧٤)

''اس سے کہو، بات بھی کرے، سایے میں بھی رہے، بیٹھے بھی اور اپنا روزہ بھی پورا کرے۔''

حضرت عمر بن الخطابؓ نے ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا: اے اللہ کے رسولؐ!

میں نے جاہلیت میں نذر مانی تھی کہ ایک دن مسجدِ حرام میں اعتکاف کروں گا۔ آں حضرت ﷺ نے فرمایا: تو پھر جاؤ! اعتکاف کرو۔ (صحیح بخاری، کتاب الاعتکاف، باب الاعتکاف لیلاً، حدیث: ۲۰۳۲ باب اذا نذر فی الجاھلیة ان یعتکف ثم اسلم، حدیث: ۲۰۴۳، صحیح مسلم، کتاب الأیمان، باب نذر الکافر وما یفعل فیه اذا اسلم، حدیث: ۱۶۵۶، یہ حدیث دیگر کتب میں بھی مروی ہے)

ایک موقع پر ایک عورت نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! میں نے نذر مانی تھی کہ اگر آپ فلاں غزوہ سے کام یاب و بامراد واپس لوٹے تو آپ کے سامنے دف بجاؤں گی۔ حضورؐ نے فرمایا: اَوْ فِیْ بِنَذْرِكَ ''اپنی نذر پوری کرلو۔'' (سنن ابی داؤد، کتاب الأیمان والنذور، باب ما یومر به من الوفاء بالنذر، حدیث: ۳۳۱۲)

معصیت کی نذروں پر عمل نہ کرنے کے سلسلے میں متعدد احادیث مروی ہیں۔ حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لاَ وَفَاءَ لِنَذْرٍ فِیْ مَعْصِیَةٍ وَلاَ فِیْمَا لاَ یَمْلِکُ الْعَبْدُ. (صحیح مسلم، کتاب النذر، باب لا وفاء لنذر فی معصیة اللّٰه، حدیث: ۳۲۹۰)

''کوئی شخص کسی معصیت کی نذر مانے یا کسی ایسی چیز کی نذر مانے، جو اس کے اختیار میں نہ ہو تو اسے پورا کرنا ضروری نہیں۔''

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

لاَ نَذْرَ فِیْ مَعْصِیَةٍ وَ کَفَّارَتُهٗ کَفَّارَةُ یَمِیْنٍ. (سنن ابی داؤد، کتاب الایمان والنذور، باب من رای علیه کفارة اذا کان فی معصیة، حدیث: ۳۲۹۰)

''معصیت کی نذر نہیں پوری کی جائے گی، اس کا وہی کفارہ ہے، جو قسم کا ہے۔''

ایک عورت حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: میں نے نذر مانی ہے کہ اپنے بیٹے کو قربان کردوں گی۔ انھوں نے جواب دیا۔ بیٹے کو قربان نہ کرو اور قسم کا کفارہ ادا کرو۔ (موطا امام مالك، کتاب النذور والأیمان، باب مالا یجوز من النذور فی معصیة اللّٰه، ۱۹۷٤)

نذر کی اقسام، شرائط، احکام اور دیگر جزئیات کتبِ فقہ میں تفصیل سے مذکور ہیں۔ ان سے رجوع کرنا چاہیے۔

قسم کا کفارہ

سوال: کچھ لوگ بہت زیادہ قسم کھاتے ہیں۔ روضۂ رسول کی قسم، خانۂ کعبہ کی قسم، باپ کی قسم۔ انھیں اس کی اہمیت کا بالکل شعور نہیں ہوتا۔ بہ راہ کرم بتائیں، کیا ان کے علاوہ دوسروں کی بھی قسم کھائی جاسکتی ہے؟ اگر قسم پوری نہ کی جائے تو اس کا کیا کفارہ ہے؟

جواب: قسم کے بارے میں درج ذیل باتیں ملحوظ رکھنے کی ہیں:

(۱) کچھ لوگ بات بات پر قسم کھاتے ہیں۔ کچھ کا تکیۂ کلام ہی قسم ہوتا ہے۔ قرآن اسے 'مہمل قسم' قرار دیتا ہے اور اس کا کوئی اعتبار نہیں کرتا۔

(۲) احادیث میں ہے کہ اگر آدمی کو قسم کھانی پڑے تو وہ صرف اللہ کی قسم کھائے۔ رسول، روضۂ رسول، قرآن، ماں باپ اور دوسری چیزوں کی قسمیں کھانے سے منع کیا گیا ہے۔

(۳) بے خیالی یا تکیۂ کلام کے طور پر کوئی شخص قسم کھالے تو اس کا اعتبار نہیں، لیکن اگر کوئی شخص پورے شعور کے ساتھ قسم کھاتا ہے اور کسی وجہ سے اسے پورا نہ کرسکے تو اسے کفارہ دینا ہوگا۔ قرآن میں قسم اور اس کے کفارہ کا حکم سورۂ مائدہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَ لٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (المائدہ:۸۹)

''تم لوگ جو مہمل قسمیں کھا لیتے ہو ان پر اللہ گرفت نہیں کرتا۔ مگر جو قسمیں تم جان بوجھ کر کھاتے ہو ان پر وہ ضرور تم سے مواخذہ کرے گا۔ (ایسی قسم توڑنے کا) کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو وہ اوسط درجہ کا کھانا کھلاؤ، جو تم اپنے بال بچوں کو کھلاتے ہو۔ یا انھیں کپڑے پہناؤ، یا ایک غلام آزاد کرو اور جو اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے

رہنے دے رکھے۔ یہ تمھاری قسموں کا کفارہ ہے جب کہ تم قسم کھا کر توڑ دو۔ اپنی قسموں کی حفاظت کیا کرو۔ اس طرح اللہ اپنے احکام تمھارے لیے واضح کرتا ہے۔ شاید کہ تم شکر ادا کرو۔''

تعویذ گنڈوں کی شرعی حیثیت

سوال: ہمارے معاشرے میں تعویذ گنڈے کا چلن عام ہے۔ اس پر اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی عقیدہ رکھتے ہیں۔ اکثر ہندو پاک کے کرکٹ کھلاڑی گلے میں تعویذ باندھے نظر آتے ہیں۔ بچوں کو نظر بد سے بچانے کے لیے تعویذ باندھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہماری عورتوں کا بھی بہت پکا عقیدہ ہے۔ مہربانی فرما کر صحیح رہنمائی فرمائیں کہ اس کی دین میں کیا حیثیت ہے؟

جواب: عربوں میں بھی تعویذ گنڈوں کا خوب چلن تھا۔ انھیں بچوں کے گلے میں لٹکایا جاتا یا بازو پر باندھا جاتا تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اس سے وہ نظرِ بد سے محفوظ رہتے ہیں اور کسی مصیبت کا شکار نہیں ہوتے۔ یہی نہیں، بلکہ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ ان کے ذریعے انسان کی تقدیر بھی بدلی جاسکتی ہے۔ وہ ان تعویذ گنڈوں کو ہی سب کچھ سمجھتے تھے۔ ان کے استعمال کے بعد وہ اللہ سے حاجت روائی کی بھی ضرورت نہیں محسوس کرتے تھے۔ اسی لیے احادیث میں تعویذ کے استعمال سے منع کیا گیا ہے اور اسے شرک قرار دیا گیا ہے۔ حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مَنْ عَلَّقَ تَمِيْمَةً فَقَدْ اَشْرَكَ. (مسند احمد، ۴/۱۵۶)

''جس نے تعویذ لٹکایا اس نے شرک کیا۔''

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے:

اِنَّ الرُّقَى وَالتَّمَائِمَ وَالتِّوَلَةَ شِرْكٌ. (ابو داؤد، کتاب الطب، باب فی تعلیق التمائم، حدیث: ۳۸۸۳، سنن ابن ماجه، ابواب الطب، باب فی تعلیق التمائم، حدیث: ۳۵۳۰)

''جھاڑ پھونک، تعویذ گنڈے اور جادو ٹونا شرک ہے۔''

تعویذ کے استعمال کو شرک قرار دیے جانے کی وجہ یہی ہے کہ اہل عرب انھیں بہ ذات خود مؤثر سمجھتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ ان سے نظر بد سے حفاظت ہوتی ہے اور مصیبتیں دور ہوتی ہیں۔ حالاں کہ مصیبتیں دور کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے، اس لیے اسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا اور اسی پر توکل کرنا چاہیے۔

اگر تعویذ قرآنی آیات اور اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات پر مشتمل ہو، یا اس میں کوئی شرکیہ بات نہ ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟ اس سلسلے میں شروع سے اختلاف رہا ہے۔ حضرات صحابہؓ میں سے ابن مسعودؓ، ابن عباسؓ، حذیفہؓ اور عقبہ بن عامرؓ وغیرہ شائبہ شرک کی وجہ سے اسے ناجائز سمجھتے تھے۔ جب کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ اس کے جواز کے قائل تھے۔

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا کوئی حصہ، رسول اللہ ﷺ سے ثابت شدہ دعائیں یا ایسے کلمات، جو شرک سے پاک ہوں، پڑھ کر جھاڑ پھونک اور دم کرنا جائز ہے۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ ایسی چیزوں کا تعویذ بھی بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن اس معاملے میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے کہ ان کے سلسلے میں بدعقیدگی اور غلط تصورات شرک تک پہنچانے والے ہیں۔

اس موضوع پر استاذ محترم مولانا سید جلال الدین عمری صدر ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ نے اپنی کتاب 'صحت ومرض اور اسلامی تعلیمات' کی بحث 'روحانی علاج' میں تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ اس سے رجوع کرنا مفید ہوگا۔

گناہ اور توبہ

سوال: بعض واعظین اپنے خطاب میں یہ کہتے ہیں کہ ''اگر بندے گناہ نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کی جگہ ایک اور مخلوق پیدا فرماتا اور اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے انھیں معاف کرتا۔ بندہ جب ایک ہاتھ اللہ کی طرف بڑھاتا ہے تو اللہ تعالیٰ دو ہاتھ بندے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ بندہ پیدل چل کر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ دوڑ کر اس کی طرف آتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ بندے کا ہاتھ بن جاتا ہے۔'' اس بات پر یہ خیال گزرتا ہے کہ گناہ کی اتنی اہمیت نہیں۔ آدمی اپنی جسارت سے کبائر اور صغائر کا مرتکب ہوسکتا ہے۔

جواب: ابلیس جب بارگاہِ الٰہی سے معتوب ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی رحمت سے دور کر دیا تو اس نے چیلنج کے انداز میں کہا تھا:

لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ○ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ وَ عَنْ اَيْمَانِهِمْ وَ عَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ○ (الاعراف:۱۶-۱۷)

''میں اب تیری سیدھی راہ پر ان انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا، آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں، ہر طرف سے ان کو گھیروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔''

اس بنا پر یہ عین ممکن ہے کہ شیطان کے بہکاوے میں آ کر اللہ کے کسی بندے سے گناہ سرزد ہو جائے۔ لیکن توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے۔ اس لیے اللہ کے گنہ گار بندوں کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ قرآن کہتا ہے:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ○ (الزمر:۵۳)

''(اے نبیؐ) کہہ دو کہ اے میرے بندو، جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے، وہ تو غفور رحیم ہے۔''

گناہ کا صدور انسان کو اللہ تعالیٰ کا مبغوض بندہ نہیں بناتا، بلکہ گناہ پر اصرار اور ڈھٹائی کرنے اور توبہ و استغفار نہ کرنے سے وہ راندۂ درگاہِ الٰہی ہوتا ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

كُلُّ بَنِيْ آدَمَ خَطَّاءٌ وَ خَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ.

(جامع ترمذی، ابواب صفة القيامة، باب المؤمن يرى ذنبه كالجبل فوقه، حديث: ۲۵۰۱، سنن ابن ماجه، ابواب الزهد باب ذكر التوبة، حديث: ۴۲۵۱)

''بنو آدم میں ہر ایک سے بہت زیادہ خطائیں سرزد ہوتی ہیں۔ ان میں بہتر لوگ وہ ہیں، جو توبہ کرنے والے ہیں۔''

توبہ کی اہمیت اور مطلوبیت پر بہت سی احادیث ہیں۔ ان میں ایک حدیث وہ بھی ہے، جس کا آپ نے تذکرہ کیا ہے۔ وہ حدیث قدسی ہے۔ یعنی وہ بات رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان کی ہے۔ پوری حدیث یہ ہے:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَ اَزِيْدُ، وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَجَزَاؤُهٗ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا اَوْ اَغْفِرُ، وَ مَنْ تَقَرَّبَ مِنِّيْ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ مِنْهُ ذِرَاعًا، وَ مَنْ تَقَرَّبَ مِنِّيْ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ مِنْهُ بَاعًا، وَ مَنْ اَتَانِيْ يَمْشِيْ اَتَيْتُهٗ هَرْوَلَةً وَ مَنْ لَقِيَنِيْ بِقُرَابِ الْاَرْضِ خَطِيْئَةً لَا يُشْرِكُ بِيْ لَقِيْتُهٗ بِمِثْلِهَا مَغْفِرَةً.

(صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء، باب فضل الذكر والدعاء والتقرب الى الله تعالى و حسن الظن به، حديث: ٢٦٨٧)

''جو شخص کوئی نیکی کرے گا اسے اس کا دس گنا، بلکہ اس سے زیادہ اجر ملے گا اور جو شخص کوئی برائی کرے گا اسے اسی کے بہ قدر بدلہ دیا جائے گا یا میں اسے معاف کر دوں گا۔ جو مجھ سے ایک بالشت قریب ہوگا میں اس سے ایک ہاتھ قریب ہوں گا۔ جو مجھ سے ایک ہاتھ قریب ہوگا میں اس کی طرف دو ہاتھ آگے بڑھوں گا۔ جو میری طرف چل کر آئے گا، میں اس کی طرف دوڑ کر جاؤں گا۔ جو شخص پوری روئے زمین کے بہ قدر خطاؤں کے ساتھ میرے پاس آئے گا، اس حال میں کہ اس نے میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہو، میں اس کے بہ قدر مغفرت کے ساتھ اس سے ملاقات کروں گا۔''

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ گناہ کی کوئی اہمیت نہیں اور آدمی جسارت کر کے چھوٹے بڑے گناہوں کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ ایک مومن سے مطلوب یہ ہے کہ وہ حتی الامکان گناہوں سے بچنے کی کوشش کرے۔ لیکن اگر بشری کم زوری کی بنا پر اس سے کبھی کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو تنبہ ہوتے ہی فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

''مومن سے گناہ کا ارتکاب ہوجائے تو وہ اتنا بوجھ محسوس کرتا ہے گویا کسی پہاڑ کے نیچے بیٹھا ہے اور ڈر رہا ہے کہ کہیں وہ پہاڑ اس کے اوپر نہ گر جائے اور فاجر گناہ کرتا ہے تو اس پر اس کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔ ایسا لگتا ہے کہ ناک پر مکھی بیٹھی تھی، ہانک دی۔''

(صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب التوبة، حدیث: ٦٣٠٨)

لیکن توبہ کے لیے محض زبان سے لفظ 'توبہ' دہرالینا کافی نہیں ہے، بلکہ پورے احساس و شعور کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع وانابت کرنی چاہیے۔ امام نوویؒ نے لکھا ہے: ''توبہ کی تین شرطیں ہیں: (۱) اس معصیت سے بالکل الگ تھلگ ہوجائے (۲) اس پر نادم ہو (۳) پختہ عزم کرے کہ پھر اس کا ارتکاب نہیں کرے گا۔ اگر اس معصیت سے کسی انسان کی حق تلفی ہوئی ہو تو مذکورہ تین شرطوں کے ساتھ ایک چوتھی شرط یہ بھی ہے کہ اس سے بری ہوجائے، اگر اس کا مال لیا ہو تو واپس کردے، کوئی الزام لگایا ہو یا غیبت کی ہو تو اس سے معافی مانگ لے۔''

(ریاض الصالحین، باب التوبة، ص: ۱۱، ۱۲)

وسوسوں کا علاج

سوال: مجھے وسوسے بہت آتے ہیں اور ایسے آتے ہیں کہ بسا اوقات خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ کہیں یہ گناہِ کبیرہ یا شرک کے دائرے میں نہ آگیا ہو۔ میری ملازمت ایسی ہے کہ مجھے جنس مخالف سے اکثر وبیش تر ملتے رہنا پڑتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے نہ بچایا ہوتا تو یقیناً میں زنا جیسے فعل کا مرتکب ہوجاتا۔ لیکن اللہ کا فضل ہے کہ لمحۂ آخر میں وہ مجھے ضرور اس دلدل سے بچالیتا ہے، لیکن نگاہ کا اور کچھ فعل بد کا عمل سرزد ہوجاتا ہے۔ برائے مہربانی مجھے کوئی وظیفہ یا کوئی طریقہ ایسا بتایئے کہ میں ان دونوں افعال سے بچ جاؤں۔

جواب: وسوسے دل میں پیدا نہ ہوں، اس پر کسی انسان کو قابو نہیں ہے۔ وہ ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ شیطان ہر ایک کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ وہ اسے بہکانے اور گناہ میں لت پت کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

اِنَّ الشَّیْطَانَ یَجْرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَی الدَّمِ.

(صحیح بخاری ،کتاب الاعتکاف، باب زیارة المرأة زوجها فی اعتکافه، حدیث: ۲۰۳۸، صحیح مسلم، کتاب السلام ،حدیث : ۲۱۷۵)

''شیطان انسان کے اندرون میں خون کی طرح دوڑتا ہے۔''

کسی مسلمان کے دل میں برے خیالات آتے ہیں، ایسے خیالات، جنھیں نہ وہ زبان پر لانے کی ہمت کرتا ہے اور نہ ان کو روبہ عمل لانے پر آمادہ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کو غلط اور گناہ کے کام سمجھتا ہے اور یہ اس کے صاحبِ ایمان ہونے کی علامت ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ چند اصحابِ رسول آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: ''ہمارے دلوں میں ایسے ایسے خیالات آتے ہیں کہ ہم انھیں زبان پر لانے کی ہمت نہیں کر سکتے۔'' آں حضرت ﷺ نے فرمایا: ''کیا واقعی ایسا ہے؟'' انھوں نے کہا: ہاں۔ آپؐ نے فرمایا:

ذاک صریح الایمان. (صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الوسوسة من الایمان، حدیث: ۱۳۲، ۱۳۳، عن ابی هریرة)

''یہ ایمان کی نشانی ہے۔''

ایک دوسری حدیث میں، جو حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے، مذکور ہے کہ ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: اے اللہ کے رسولؐ! بسا اوقات میرے دل میں ایسے خیالات آتے ہیں کہ انھیں زبان پر لانے سے بہتر ہے کہ میں جل کر راکھ ہو جاؤں۔ آپؐ نے تین مرتبہ اللّٰہ اکبر کہا، پھر فرمایا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ رَدَّ کَیْدَهٗ اِلَی الْوَسْوَسَةِ. (سنن ابی داؤد، کتاب الآداب، باب فی ردّ الوسوسة، حدیث: ۵۱۱۲)

''اللہ کا شکر ہے، جس نے شیطان کے مکر و فریب کو وسوسہ کی جانب پھیر دیا۔''

دل میں جو وسوسے پیدا ہوتے ہیں، اگر انسان انھیں زبان پر لائے نہ ان کے مطابق اعضاء و جوارح کو حرکت دے تو وہ قابلِ معافی ہیں، ان پر اللہ تعالیٰ اس کی گرفت نہیں فرمائے گا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ لِیْ عَنْ اُمَّتِیْ مَا وَسْوَسَتْ بِهٖ صُدُوْرُهَا مَالَمْ تَعْمَلْ اَوْ تَكَلَّمْ. (صحیح بخاری، کتاب العتق، باب الخطأ والنسیان، حدیث: ۲۵۲۸، **ودیگر ابواب**، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تجاوز اللّٰہ عن حدیث النفس والخواطر بالقلب اذا لم تستقر، حدیث: ۱۲۷)

''میری امت کے افراد کے دلوں میں وسوسے پیدا ہوں، لیکن وہ ان کے مطابق عمل کریں نہ انھیں زبان پر لائیں تو اللہ تعالیٰ ان پر ان کی باز پرس نہیں کرے گا۔''

ایک دوسری حدیث سے، جو اس سے زیادہ مفصّل ہے، اللہ تعالیٰ کی کمالِ رحمت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے مطابق اگر کسی انسان کے دل میں کسی برے کام کا ارادہ پیدا ہو، لیکن وہ اس پر عمل نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے نامۂ اعمال میں ایک نیکی لکھ دیتا ہے۔ پوری حدیث یہ ہے:

اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ، ثُمَّ بَيَّنَ ذٰلِكَ، فَمَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهٗ عِنْدَهٗ حَسَنَةً كَامِلَةً، فَاِنْ هُوَ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهٗ عِنْدَهٗ عَشْرَ حَسَنَاتٍ اِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ اِلٰى أَضْعَافٍ كَثِيْرَةٍ وَ مَنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهٗ عِنْدَهٗ حَسَنَةً كَامِلَةً، فَاِنْ هُوَ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهٗ سَيِّئَةً وَاحِدَةً.

(صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب من هم بحسنة أو سیئة، حدیث ٦٤٩١، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب اذا همّ العبد بحسنة کتبت و اذا هم بسیئة لم تکتب، حدیث: ۱۳۱)

''اللہ نے نیکیوں اور برائیوں کو طے کر دیا ہے اور ان کی وضاحت کر دی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی نیکی کا ارادہ کرے، مگر اس پر عمل نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے نامۂ اعمال میں ایک پوری نیکی لکھ دیتا ہے اور اگر وہ ارادہ کرنے کے بعد اس پر عمل بھی کر لے تو اس پر

اسے دس نیکی سے سات سو گنا تک، بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ اجر دیتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص کسی برائی کا ارادہ کرے، مگر اس پر عمل نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس پر اس کے لیے ایک پوری نیکی لکھ دیتا ہے اور اگر وہ اس پر عمل بھی کر لے تو اس کے نامۂ اعمال میں صرف ایک برائی لکھ دیتا ہے۔''

وسوسے دل میں پیدا ہوں تو انھیں جھڑک دیجیے۔ کوشش کیجیے کہ بات آگے تک نہ بڑھنے پائے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہیے کہ وہ آپ کو ہر طرح کی معصیتوں سے بچائے۔ اس احساس کو تازہ رکھیے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات علیم وخبیر ہے۔ وہ نگاہوں کی چوری اور دلوں کے بھید سے بھی باخبر ہے:

يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ○ (المومن:۱۹)

''اللہ نگاہوں کی چوری تک سے واقف ہے اور وہ راز تک جانتا ہے، جو سینوں نے چھپا رکھے ہیں۔''

اور اگر کبھی شیطان کے بہکاوے میں آجائیں اور کسی معصیت کا ارتکاب کر بیٹھیں تو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹیے۔ اس کے سامنے گڑگڑائیے، اس سے معافی مانگیے اور اس معصیت کا دوبارہ ارتکاب نہ کرنے کا عزم کیجیے۔ یہ وظیفہ ان شاء اللہ آپ کو گناہوں سے بچانے میں معاون ثابت ہوگا۔

گھر سے نکلنے کے آداب

سوال: میں ایک انٹر کالج میں معلّمی کے فرائض انجام دیتا ہوں۔ ہم اساتذہ میں دینی معلومات کی کمی کے باعث بعض معاملات میں بحث ومباحثہ ہو جایا کرتا ہے۔ ایک موقعے پر ہمارے درمیان اس معاملے میں اختلاف ہو گیا کہ گھر سے نکلتے وقت داہنا پیر پہلے نکالنا چاہیے یا بایاں پیر؟ ایک مقامی عالمِ دین سے رجوع کیا گیا تو انھوں نے داہنا پیر پہلے نکالنے کی بات بتائی اور دلیل یہ دی کہ رسول اللہ ﷺ ہر کام دائیں طرف سے شروع کرتے تھے۔ ایک دوسرے عالمِ دین نے کسی حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ مسجد اور گھر امن کی جگہ ہے، چناں چہ مسجد اور گھر سے نکلتے

وقت پہلے بایاں پیر باہر نکالنا چاہیے۔ علماء کے متضاد جوابات سے ہمیں کنفیوژن ہو گیا ہے۔ بہ راہِ کرم اس سلسلے میں ہماری صحیح رہ نمائی فرمائیں۔ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ کیا تھا؟ ہم لوگوں کو کیا طریقہ اپنانا چاہیے؟

جواب: اللہ کے رسول ﷺ سے غایت درجہ محبت کی دلیل یہ ہے کہ مسلمان اپنی زندگی کے روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے کاموں کے سلسلے میں بھی یہ جاننے کی کوشش کرے کہ انھیں آپ کس طرح انجام دیتے تھے؟ اور پھر اسی طرح خود بھی عمل کرنے کی کوشش کرے۔ اللہ تعالیٰ یہ جذبہ ہر مسلمان کے دل میں پیدا فرمائے۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُحِبُّ التَّيَمُّنَ مَا اسْتَطَاعَ فِي شَانِهِ كُلِّهِ، فِي طُهُوْرِهِ وَ تَرَجُّلِهِ وَ تَنَعُّلِهِ. (صحيح بخاری، كتاب الصلاة، باب التيمّن فی دخول المسجد وغيره، حديث:٤٢٦، صحيح مسلم، كتاب الطهارة، باب التيمن فی الطهور وغيره، حديث:٢٦٨)

''نبی ﷺ سے جہاں تک ممکن ہوتا تھا، اپنا ہر کام، مثلاً طہارت (وضو و غسل)، کنگھی کرنا، جوتے پہننا وغیرہ، داہنی طرف سے شروع کرتے تھے۔''

امام بخاریؒ نے اس حدیث کو اپنی صحیح میں مختلف سندوں سے الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ پانچ مقامات پر روایت کیا ہے (۱۶۸، ۴۲۶، ۵۳۸۰، ۵۸۵۴، ۵۹۲۶) اور اس کے ذریعے وضو، غسل، مسجد میں داخلہ، کھانا کھانے، جوتا پہننے اور کنگھی کرنے میں داہنی طرف سے آغاز کرنے کا اثبات کیا ہے۔

بعض اور احادیث بھی ہیں، جن میں صراحت ہے کہ آں حضرت ﷺ بعض کاموں کو داہنی طرف سے انجام دیتے تھے۔ مثلاً آپؐ داہنے ہاتھ سے کھانا کھاتے تھے۔ (مسند احمد، ۶/۱۶۵، ۲۸۷) اور دوسروں کو بھی اس کی تاکید کرتے تھے۔ (بخاری: ۵۳۷۶) آپ داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔ (نسائی: ۵۲۰۶، ۵۲۰۷، ابن ماجہ: ۳۶۴۷) آپؐ نے فرمایا کہ جب کپڑا پہنو یا وضو کرو تو داہنی طرف سے آغاز کرو۔ (ابو داؤد: ۴۱۴۱) آپؐ قمیص پہنتے تو داہنی طرف سے آغاز کرتے۔ (ترمذی: ۱۷۶۶)

آپؐ غسل کرتے تو داہنی طرف سے ابتدا کرتے۔ (مسلم:۷۲۹) دوسری طرف بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت ﷺ داہنے ہاتھ سے بعض کاموں کی انجام دہی کو ناپسند کرتے تھے، مثلاً آپؐ نے رفع حاجت کے بعد داہنے ہاتھ سے استنجا کرنے سے منع کیا ہے۔ (بخاری:۱۵۴، مسلم:۶۱۳، ۶۱۵، ابوداؤد: ۳۱۱۷، نسائی:۴۰، ابن ماجہ: ۳۱۰، ۳۱۲) اسی طرح مسجد سے نکلتے وقت بھی آپ پہلے بایاں پیر نکالتے تھے۔ (مستدرک حاکم بہ حوالہ فتح الباری ۱/۵۲۳)

ام المومنین حضرت حفصہؓ فرماتی ہیں:

اِنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ یَجْعَلُ یَمِیْنَهٗ لِطَعَامِهٖ وَ شَرَابِهٖ وَ ثِیَابِهٖ وَ یَجْعَلُ شِمَالَهٗ لِمَا سِوٰی ذٰلِکَ. (سنن ابی داؤد، کتاب الطھارۃ، حدیث:۳۲)

''نبی ﷺ کھانا کھانے، پانی پینے اور کپڑے پہننے کے لیے دایاں ہاتھ استعمال کرتے تھے، بائیں ہاتھ سے دوسرے کام کرتے تھے۔''

اس مضمون کی اور بھی بہت سی احادیث ہیں۔ ان سے علماء نے ایک قاعدہ مستنبط کیا ہے۔ اس کا تذکرہ امام نوویؒ نے یوں کیا ہے:

''شریعت کا ایک مستقل قاعدہ یہ ہے کہ جو کام 'تکریم وتشریف' کے قبیل کے (یعنی اچھے کام) ہوں، مثلاً: کپڑے، پاجامہ، موزے پہننا، مسجد میں داخل ہونا، مسواک کرنا، سرمہ لگانا، ناخن تراشنا، مونچھ کترنا، بال سنوارنا، نماز میں سلام پھیرنا، اعضائے طہارت دھونا، بیت الخلاء سے نکلنا، کھانا پینا، مصافحہ کرنا، حجر اسود کا استلام کرنا اور ان جیسے دیگر کام، انھیں داہنی جانب سے انجام دینا مستحب ہے۔ اور جو کام اس کے برعکس ہوں مثلاً بیت الخلاء میں داخل ہونا، مسجد سے نکلنا، ناک صاف کرنا، استنجاء کرنا، کپڑے، پاجامہ، موزہ اتارنا وغیرہ ان کا آغاز بائیں جانب سے کرنا مستحب ہے۔''
(شرح صحیح مسلم، ۲/۱۶۰)

گھر سے نکلتے وقت کون سا پیر پہلے باہر نکالنا چاہیے؟ اس ضمن میں آں حضرت ﷺ کا کیا معمول تھا؟ اس سلسلے میں احادیث میں مجھے کوئی صراحت نہیں مل سکی۔ گھر کو مسجد پر قیاس کرنا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ جس حدیث کی طرف آپ نے ایک عالم دین کے حوالے سے اشارہ کیا ہے، وہ بھی مجھے نہیں مل سکی۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی

حدیث کے عموم کو دیکھتے ہوئے گھر سے نکلتے وقت دایاں پیر پہلے باہر نکالنا چاہیے۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ گھر سے نکلتے وقت اور گھر میں داخل ہوتے وقت اذکار اور دعاؤں کا اہتمام کرنا چاہیے۔ یہاں گھر سے نکلتے وقت کی دو دعائیں نقل کی جارہی ہیں۔ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ جب بھی میرے گھر سے نکلتے تھے، یہ دعا پڑھتے تھے:

بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ، اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ اَنْ اَضِلَّ اَوْ اُضَلَّ، اَوْ اَزِلَّ اَوْ اُزَلَّ اَوْ اَظْلِمَ اَوْ اُظْلَمَ، اَوْ اَجْهَلَ اَوْ يُجْهَلَ عَلَيَّ. (سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب ما یقوم اذا خرج من بیته، حدیث: ٥٠٩٤، سنن ترمذی، ابواب الدعوات، حدیث:٣٤٢٣)

''اللہ کے نام سے۔ میں نے اللہ پر بھروسہ کیا۔ اے اللہ! میں تجھ سے اس بات کی پناہ مانگتا ہوں کہ بھٹک جاؤں یا کوئی مجھے بھٹکا دے، پھسل جاؤں یا کوئی مجھے پھسلا دے، میں کسی پر ظلم کروں یا کوئی مجھ پر ظلم کرے، میں کسی کے ساتھ ناشائستگی سے پیش آؤں یا کوئی میرے ساتھ ناز یبا برتاؤ کرے۔''

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مَنْ قَالَ يَعْنِیْ اِذَا خَرَجَ مِنْ بَيْتِهٖ بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ يُقَالُ لَهٗ كُفِيْتَ وَ وُقِيْتَ وَ تَنَحّٰى عَنْهُ الشَّيْطَانُ. (جامع ترمذی، ابواب الدعوات، یاب ما یقول اذا خرج من بیته، حدیث:٣٤٢٢، سنن ابی داؤد، کتاب الادب، حدیث:٥٠٩٥)

''جو شخص گھر سے نکلتے وقت یہ دعا پڑھتا ہے: بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ (اللہ کے نام سے، میں نے اللہ پر بھروسہ کیا، اللہ کے علاوہ اور کوئی طاقت وقوت کا مالک نہیں) تو اس سے کہا جاتا ہے: تم راہ یاب ہوگئے، اللہ تمھارے لیے کافی ہے، تم شر سے محفوظ ہوگئے اور شیطان اس سے دور ہو جاتا ہے۔''

غیر مسلموں کی تقریبات میں چندہ دینا

سوال: کیا بھائی چارہ کے لیے ایک مسلم کو رام لیلا میں غیر مسلموں کو چندہ دینا جائز ہے؟

جواب: غیر مسلموں کی مذہبی تقریبات میں تعاون کرنا اور چندہ دینا درست نہیں ہے۔ ایسا کرنا تعاون علی الاثم والمعصیۃ ہے۔ اسلامی فقہ اکیڈمی کے چودھویں فقہی سمینار منعقدہ دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد مورخہ ۲۰-۲۲/جون ۲۰۰۴ میں یہ موضوع زیر بحث آیا تھا۔ اس میں تمام شرکائے سمینار علماء نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا تھا۔ البتہ بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اگر فساد وضرر کا اندیشہ ہو اور جان، مال، عزت وآبرو اور ملازمت چلے جانے کا خطرہ ہو تو بہ کراہتِ خاطر اور اضطراراً تعاون کرنا درست ہوگا۔

کمیشن پر چندہ

سوال: یہاں مسجد اور مدرسے کے چندے کے لیے کمیشن سسٹم رائج ہے۔ منتظمین کا کہنا ہے کہ تنخواہ کے مقابلے میں کمیشن (جو پچیس سے پچاس فی صد ہوتا ہے) پر چندے کی وصولی زیادہ ہوتی ہے۔ کیا شرعی نقطۂ نظر سے یہ طریقہ جائز ہے؟

جواب: مسجد ومدرسہ کے لیے کمیشن پر چندہ کی وصولی کا مروجہ سسٹم درست نہیں ہے۔ اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے پانچویں کل ہند سمینار منعقدہ ۳۰، ۳۱/اکتوبر، یکم و ۲/نومبر ۱۹۹۲ جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ (یوپی) میں کمیشن پر زکوٰۃ کی وصولی کا موضوع زیر بحث آیا تھا۔ مقالات اور شرکاء کے مباحثوں کی روشنی میں تمام علماء نے طے کیا تھا کہ کمیشن پر زکوٰۃ کی وصولی کا مروّجہ طریقہ جائز نہیں ہے۔ (ملاحظہ کیجیے، اہم فقہی فیصلے، شائع کردہ اسلامک فقہ اکیڈمی، نئی دہلی)

دینی اجتماعات کی فوٹو گرافی

سوال: آج سے بیس پچیس سال قبل جماعت اسلامی ہند میں فوٹو گرافی اور فوٹو کھنچوانے کا رواج نہیں تھا۔ ہمارے علماء اور اکابر اسے ناپسند کرتے تھے، کسی جلسۂ عام میں اگر پریس رپورٹر آجاتے تھے، ان کے پاس کیمرے ہوتے تو وہ فوٹو کھینچ لیا کرتے تھے۔ ہمارے علماء اور اکابر میں ایسے بھی

تھے، جو فوٹوگرافی کروانے سے منع کر دیتے تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جو کیمرے کی زد میں آنے سے بچنے کے لیے چہرے پر کسی کاپی یا کتاب کی اوٹ کرلیا کرتے تھے۔ ان کا یہ رویہ تحریکی مزاج اور تقویٰ سے کس حد تک ہم آہنگ تھا، یہ وہ جانیں۔ یہ وہ علماء اور اکابر تھے، جو ناگزیر ضرورت سامنے آنے پر ہی فوٹو کھنچواتے تھے۔ مگر اب یعنی مولانا ابواللیث ندویؒ کی امارت کے بعد سے فوٹوگرافی اور فوٹو کھنچوانے کی ہمارے یہاں ایک وبا سی آگئی ہے اور اس وبا کو جنم دینے اور پروان چڑھانے میں ہماری قیادت کا مؤثر رول ہے۔

قرآن حکیم، حضرت محمد ﷺ اور حقوق انسانی کے تحفظ وغیرہ عنوانات پر جماعت نے جو حلقے اور کل ہند سطح پر مہمیں چلائی ہیں ان میں تو گویا فوٹوگرافی کا ایک زبردست طوفان امڈ پڑا تھا۔ اب ہمارا کوئی بھی اجتماع، خواہ وہ ضلع کی سطح کا ہو یا صوبہ کی سطح کا، ہمارا کوئی بھی خطاب عام، خواہ کہیں بھی ہو، فوٹوگرافروں کی خدمات حاصل کیے بغیر نہیں ہوتا۔ ہمارا اسٹیج اب اتنی وسعت اختیار کر گیا ہے کہ اس پر درجہ بہ درجہ ذمہ داران کے جلوہ افروز ہونے اور فوٹو کھنچوانے کی گنجائش پیدا کر لی گئی ہے۔ ہمارے ملکی سیشن، ملّی سیشن، سمپوزیم اور سیمینار میں اظہارِ خیال کرنے والوں کے فوٹو (مسلم وغیر مسلم دونوں کے) پورے اہتمام کے ساتھ کھنچوائے جاتے ہیں۔ بعد میں ان کی طلب پر اور اکثر بلا طلب ان کے پاس ارسال کیے جاتے ہیں۔ ہمارے دفاتر میں ان فوٹوؤں کے البم قطار اندر قطار سجا کر رکھے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ خواتین کے اجتماعات میں بھی فوٹوگرافی ہوتی ہے۔

بعض ذمے داران سے جب دریافت کیا جاتا ہے کہ یہ سب کیا اور کیوں ہو رہا ہے؟ تو جواب ملتا ہے کہ ’’یہ دور سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے۔ اگر ہم یہ سب نہ کریں گے تو بہت پیچھے رہ جائیں گے۔‘‘ جائز ناجائز کی بات کیجیے تو جواب ملتا ہے کہ ’’موجودہ حالات نے ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ ہم یہ سب کچھ کریں۔ ہم ان سے بچنا چاہیں بھی تو نہیں بچ سکتے۔‘‘ جواب کی تان یہاں آکر ٹوٹتی ہے کہ یہ سب تو ہمارے اکابر اور علماء کرام خود مرکز جماعت میں کرتے ہیں اور دوروں میں ان کے جو پروگرام ہوتے ہیں ان میں ان کی مرضی اور ہدایت سے یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ پھر جب ہم اپنے مرکزی علماء کرام اور قائدین سے دریافت کرتے ہیں تو جواب میں ہمیں مسکراہٹ آمیز خاموشی سے سابقہ پیش آتا ہے۔ میرے نزدیک آپ بھی تحریک و جماعت کے قابلِ ذکر علماء میں

سے ایک ہیں، جن کی نظر قرآن حکیم اور سنتِ رسولؐ پر گہری ہے، جو تحریک و جماعت کے مزاج شناس ہیں۔ میں آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ خود آپ کا ضمیر، آپ کا علم قرآن وسیرت اس سلسلے میں کیا کہتا ہے؟

جواب: جواب میں آسانی کے لیے مذکورہ بالا سوال کے تین اجزا کیے جاتے ہیں:

(۱) فوٹو گرافی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ جائز ہے یا ناجائز؟

(۲) جماعتِ اسلامی ہند کے قدیم اکابر فوٹو کھنچوانے سے احتراز کرتے تھے اور حتی الامکان اس سے بچتے تھے، لیکن موجودہ قیادت کو اس معاملے میں نہ صرف یہ کہ کوئی تکلّف نہیں رہا، بلکہ وہ پورے اہتمام سے اس کا انتظام کرتی ہے۔ قدیم اکابر کا رویہ درست تھا یا موجودہ قائدین کا؟

(۳) فوٹو گرافی اگر جائز بھی ہو تو کیا جماعت میں ہر سطح پر اس سے، جس حد تک اشتغال اور دل چسپی پائی جاتی ہے، اسے پسندیدہ قرار دیا جاسکتا ہے؟

سطور ذیل میں ہر جز کا الگ الگ جواب دیا جارہا ہے:

(۱) بہت سی صحیح احادیث میں تصویر اور تصویر سازی کی شدید مذمت بیان کی گئی ہے۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

اِنَّ الْمَلاَئِکَةَ لاَ تَدْخُلُ بَیْتًا فِیْهِ صُوْرَةٌ. (صحیح بخاری، حدیث: ۳۲۲٤، صحیح مسلم، حدیث: ۲۱۰۷)

''فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے، جس میں کوئی تصویر ہو۔''

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَذَابًا عِنْدَ اللّٰهِ الْمُصَوِّرُوْنَ. (صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب عذاب المصوّرین یوم القیامة حدیث: ۵۹۵۰، صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینة، باب تحریم تصویر صورة الحیوان حدیث: ۲۱۰۹)

''اللہ کے نزدیک سب سے سخت عذاب کے مستحق تصویر بنانے والے ہیں۔''

کیا موجودہ دور کی فوٹوگرافی بھی اسی ممانعت کے حکم میں داخل ہے؟ بہت سے علماء کا خیال ہے کہ نہیں۔ ان کے نزدیک ممانعت کی جتنی حدیثیں ہیں ان کا تعلق ان تصویروں سے ہے، جو تراشی جاتی ہیں یا مجسم شکل میں ہوتی ہیں۔ رہے فوٹوگرافس تو ان کی حیثیت سایہ کی ہے، جسے کیمرہ میں قید کرلیا جاتا ہے۔ اس کا تعلق ان تصویروں سے نہیں ہے، جن کا بنانا حرام ہے۔ البتہ یہ علماء اس بات کے قائل ہیں کہ تصویر کی حرمت وحلّت کا تعلق اس چیز سے ہے، جس کی تصویر بنائی جارہی ہے۔ چناں چہ ان کے نزدیک بھی عورتوں کی عریاں ونیم عریاں تصاویر اور جو تصاویر بت پرستی کی علامت یا دیگر مذاہب کی خاص پہچان ہوں، ان کا بنانا جائز نہیں ہے۔ یہ عالم عرب کے علماء کا عام موقف ہے۔ برصغیر ہندو پاک کے علماء اس معاملے میں تحفظ رکھتے ہیں۔ وہ کیمرہ سے لی گئی تصویر کو بھی جائز نہیں قرار دیتے، لیکن عمل اب ان کا بھی علمائے عرب سے مختلف نہیں رہا ہے۔

(۲) تحریکِ اسلامی ہند کے قدیم اکابر تصویر سازی اور فوٹوگرافی کے معاملے میں علمائے ہند کے مثل احتیاط اور احتراز کی پالیسی پر گام زن تھے۔ وہ فوٹو کھنچوانے کی خواہش رکھتے تھے، نہ کبھی کوشش کرتے تھے، بلکہ اگر کبھی میڈیا سے تعلق رکھنے والے فوٹوگرافران کا فوٹو کھینچنے کی کوشش کرتے تھے تو وہ کیمرہ کی زد سے بچنے کی ہر ممکن تدبیر اختیار کرتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ قائدین جماعت کی اس شدّتِ احتیاط میں کمی آتی گئی۔ یہاں تک کہ اب خود ذمے دارانِ جماعت کی جانب سے مختلف دینی پروگراموں کی فوٹوگرافی کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ نقطۂ نظر کی اس تبدیلی میں حالات کے دباؤ، تصویر سازی اور فوٹوگرافی کی ٹکنالوجی کی روز افزوں ترقی، میڈیا کی غیر معمولی اہمیت اور اچھے دینی پروگراموں کی افادیت کی توسیع کی خواہش کے رول سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، موجودہ دور کی فوٹوگرافی کی حرمت پر تمام علماء کا اتفاق نہیں ہے۔ جن علماء نے احادیثِ تحریم کا تجزیہ کرکے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ موجودہ دور کی فوٹوگرافی پر ان کا اطلاق نہیں ہوتا، ان کے دلائل پر غور کرنا چاہیے۔ بلاشبہ تحریک اسلامی ہند کے قدیم اکابر کا رویہ غایت درجہ احتیاط پر مبنی تھا، لیکن موجودہ قائدین کے رویے کو بھی ناجائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔

(۳) اگر بعض مخصوص شرائط کے ساتھ فوٹوگرافی کے جواز کی رائے پر عمل کیا جائے تو بھی اس رویے کو پسندیدہ نہیں قرار دیا جاسکتا، جس کی شکایت درج بالا سوال میں کی گئی ہے۔ فوٹوگرافی کو صرف اجتماعات اور مہموں کی ریکارڈنگ تک محدود رکھنا چاہیے۔ دعوتِ دین کا کام بڑا

مبارک اور قابلِ قدر کام ہے۔ یہ انبیائی مشن ہے، لیکن اس راہ میں ہر لمحہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ شیطان اس راہ میں کام کرنے والوں کے دلوں میں خود نمائی اور نمود و نمائش کی خواہشات نہ ابھار دے۔ اس خواہش کا دل کے کسی گوشے میں پیدا ہو جانا کارِ دعوت کے لیے سمِّ قاتل ہے۔ اس لیے داعیانِ دین کو ہمہ وقت چوکنا رہنا چاہیے۔

فوٹو گرافی میں بہت زیادہ اشتغال اور اس کے بے تحاشا استعمال میں خاصے مصارف بھی آتے ہیں، جن کی ادائی عموماً جماعت کے بیت المال سے کی جاتی ہے۔ اجتماعی اموال کی حفاظت اور صحیح، جائز اور موزوں مصارف میں ان کا خرچ ان لوگوں کی ذمے داری ہے، جن کے زیرِ قبضہ وہ اموال ہوں۔ اس معاملے میں بے احتیاطی، فضول خرچی اور غلط مصرف 'غلول' (مالِ غنیمت میں چوری) کے دائرہ میں آجاتا ہے، جس پر قرآن و حدیث میں جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔

دینی اجتماعات میں خواتین کے لیے پروجیکٹر کا استعمال

سوال: ادارہ فلاح الدارین کے نام سے ہم ایک ادارہ چلا رہے ہیں، جس کے تحت مختلف اوقات میں کانفرنسوں اور دینی اجتماعات کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ ان میں عورتوں کو بھی مدعو کیا جاتا ہے، لیکن بدقسمتی سے ہمارے یہاں مساجد میں خواتین کے لیے الگ جگہیں مخصوص نہیں ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے ہم انھیں مسجد کی دوسری منزل پر بٹھاتے ہیں۔ چوں کہ مقرر سامنے نہ ہونے کی وجہ سے خواتین کی توجہ پروگرام سے ہٹ جاتی ہے اور مقصد فوت ہو جاتا ہے، اس لیے اگر پروگرام کو مؤثر بنانے کے لیے خواتین کے لیے Projector یا L.C.D. کا انتظام کیا جائے تو کیا ایسا کرنا جائز ہوگا؟ مہربانی کرکے ہماری رہ نمائی فرما کر مشکور فرمائیں۔

جواب: دینی احکام اور تعلیمات کے مخاطب، جس طرح مرد ہیں اسی طرح خواتین بھی ہیں۔ اس لیے ان کی دینی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنا اور اس کے لیے مختلف تدابیر اختیار کرنا پسندیدہ اور مطلوب ہے۔

عہدِ نبوی میں خواتین بھی حدود و آداب کی رعایت کے ساتھ اللہ کے رسول ﷺ کی مجلسوں میں شریک ہوتی تھیں، آپؐ سے مختلف مسائل دریافت کرتی تھیں اور آپ ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام فرماتے تھے۔ بعض مخصوص ایام میں آپؐ صرف خواتین کے اجتماعات کو خطاب کرتے تھے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک عورت نبی کریم ﷺ کی

خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! آپ کے وعظ وارشاد سے صرف مرد ہی فیض اٹھاتے ہیں، اس لیے ایک دن ہمارے لیے خاص کر دیجیے، جس میں ہم عورتیں اکٹھا ہو کر آپ سے تعلیم حاصل کیا کریں۔ آپؐ نے فرمایا: تم سب فلاں دن فلاں جگہ اکٹھی ہو جانا۔ چناں چہ عورتیں مقررہ وقت پر بتائی ہوئی جگہ اکٹھا ہوئیں۔ آپؐ وہاں تشریف لے گئے اور انھیں دینی باتیں بتائیں۔ (صحیح بخاری، کتاب الاعتصام، باب تعلیم النبی امته من الرجال والنساء، حدیث: ۷۳۱۰)

ایک مرتبہ آں حضرت ﷺ نے عید الفطر (یا عید الاضحیٰ) کا خطبہ دیا۔ پھر آپ کو احساس ہوا کہ آپ کی آواز عورتوں تک نہیں پہنچ سکی ہے۔ چناں چہ آپؐ اس جگہ تشریف لے گئے جہاں عورتیں اکٹھی تھیں اور انھیں وعظ وتلقین کی۔ (صحیح بخاری، کتاب العلم، باب عظة الامام النساء و تعلیمهن، حدیث: ۹۸، امام بخاریؒ نے یہ حدیث مزید پندرہ مقامات پر ذکر کی ہے اور اس سے مختلف مسائل کا استنباط کیا ہے)

دینی اجتماعات کا ایک اہم مقام مساجد ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں ان میں خواتین کی حاضری کی روایت نہیں ہے۔ وہ اپنے مختلف کاموں اور ضروریات کی انجام دہی کے لیے ہر جگہ پہنچ جاتی ہیں، لیکن مساجد کے دروازے ان کے لیے بند ہیں۔ وہاں کے خطبوں، وعظ و ارشاد کی مجلسوں اور دینی اجتماعات سے ان کے استفادے کی صورت نہیں ہے۔ عہد نبوی میں عورتیں مسجد جایا کرتی تھیں اور آں حضرت ﷺ نے مردوں اور عورتوں کے درمیان کم سے کم اختلاط ہونے کی خصوصی تدابیر اختیار فرمائی تھیں۔ چناں چہ ان کی صفیں علاحدہ کر دی تھیں اور ان کے لیے مسجد کا ایک دروازہ خاص کر دیا تھا، جس سے مردوں کو آنے جانے کی ممانعت تھی۔

مساجد یا دوسرے مقامات پر منعقد ہونے والے دینی اجتماعات میں خواتین کو بھی شریک کرنا چاہیے اور اس کے لیے خصوصی انتظامات کرنے چاہئیں۔ مثلاً ان کی نشستیں الگ ہوں اور پردے کا بھی مناسب انتظام ہو۔ یہ صورت بھی اچھی ہے کہ مسجد کی دوسری منزل پر انھیں بٹھایا جائے۔

یہ صحیح ہے کہ مقرر سامنے نہ ہونے کی وجہ سے سامعین کی توجہ ہٹتی ہے۔ اس لیے دوسری منزل پر رہنے والے لوگوں کے لیے، خواہ وہ مرد ہوں یا خواتین، ٹیلی ویژن یا پروجیکٹر لگانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ تصویر کی حرمت کے سلسلے میں، جو آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی ہیں، محقق علماء کا خیال ہے کہ ان کا اطلاق اس صورت پر نہیں ہوتا۔

گزشتہ سال اپنے سفرِ خلیج کے دوران میں نے جگہ جگہ دیکھا کہ وہاں کے دین پسند حلقے اپنے چھوٹے چھوٹے پروگراموں میں بھی پروجیکٹر کا استعمال کرتے ہیں اور دینی اجتماعات میں اپنی خواتین کو بھی شریک کرتے ہیں۔ ایک موقعے پر مجھے خواتین کے ایک اجتماع سے خطاب کا موقع ملا۔ ایک کمرے میں خواتین اکٹھا تھیں۔ دوسرے کمرے میں بیٹھ کر مائک سے میں نے درس قرآن دیا۔ خواتین نے اپنے کمرے میں ٹی وی اسکرین پر میرا درس سنا۔ درس کے بعد انھوں نے تحریری اور زبانی سوالات کیے، جن کے جوابات دیے گئے۔

انبیاء اور ان کی امتوں سے میثاقِ الٰہی

سوال: سورۂ آل عمران، آیت: ۸۱ میں آنے والے رسول سے تمام انبیاء پر، جو ایمان لانے اور مدد کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ کیا یہ عہد حضرت محمد ﷺ کے لیے تھا؟

جواب: سورۂ آل عمران کی آیت: ۸۱ درج ذیل ہے:

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ (آل عمران: ۸۱)

''یاد کرو اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ ''آج میں نے تمھیں کتاب اور حکمت و دانش سے نوازا ہے، کل اگر کوئی دوسرا رسول تمھارے پاس اسی تعلیم کی تصدیق کرتا ہوا آئے، جو پہلے سے تمھارے پاس موجود ہے تو تم کو اس پر ایمان لانا ہوگا اور اس کی مدد کرنی ہوگی۔'' یہ ارشاد فرما کر اللہ نے پوچھا ''کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمہ داری اٹھاتے ہو؟'' انھوں نے کہا ''ہاں ہم اقرار کرتے ہیں،'' اللہ نے فرمایا ''اچھا تو گواہ رہو اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں۔'' اس کے بعد جو اپنے عہد سے پھر جائے وہی فاسق ہے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے، جس عہد (میثاق) کا تذکرہ ہے وہ کس سے لیا گیا تھا؟ اس سلسلے میں مفسرین نے دو توجیہیں کی ہیں۔ ایک توجیہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام پیغمبروں سے عہد لیا تھا اور وہ عہد یہ تھا کہ جس دین کی تبلیغ و اشاعت کے لیے تمھیں مبعوث کیا گیا ہے، وہی دین میری طرف سے کوئی دوسرا رسول لے کر جائے تو اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا۔ یہ عہد

اگر چہ بہ ظاہر پیغمبروں سے لیا گیا، لیکن اصلاً اس کے مخاطب ان کے پیروکار تھے۔ اس توجیہ کی صورت میں یہ عہد حضرت محمد ﷺ کے لیے خاص نہیں، بلکہ ہر آنے والے پیغمبر کے لیے ہوگا۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ یہ عہد پیغمبروں سے نہیں، بلکہ پیغمبروں کے بارے میں اہل کتاب (بنی اسرائیل) سے لیا گیا تھا۔ 'میثاق النبیین' میں میثاق کی اضافت فاعل کی طرف نہیں، بلکہ مفعول کی طرف ہے۔ اہل کتاب سے لیے گئے میثاق الٰہی کا تذکرہ قرآن کے دوسرے مقامات پر بھی ہے۔ (ملاحظہ کیجیے البقرۃ: ۶۳، ۸۳-۸۴، ۹۳، آل عمران: ۱۸۷، النساء: ۱۵۴، المائدۃ: ۱۲، الاعراف: ۱۶۹) اس توجیہ کی صورت میں آیت میں وارد لفظ 'رسول' اگر چہ نکرہ ہے، لیکن اس سے مراد اللہ کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ ہیں۔ اہل کتاب سے آپ ﷺ پر ایمان لانے اور آپؐ کی تائید و نصرت کرنے کا عہد لیا گیا تھا، مگر انھوں نے اس کی پاس داری نہیں کی۔ قدیم مفسرین میں سے طبریؒ (جامع البیان عن تاویل آی القرآن، ۶/ ۵۵۰-۵۶۱) اور رازیؒ (مفاتیح الغیب، ۲/ ۵۰۶-۵۱۰) نے دونوں توجیہیں درج کی ہیں اور سلف میں ان کے قائلین کے نام اور دلائل تفصیل سے ذکر کیے ہیں۔ متاخرین میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (تفہیم القرآن، ۱/ ۲۶۹) نے پہلی توجیہ اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ (تدبر قرآن، ۱/ ۷۳۵-۷۳۷) نے دوسری توجیہ کو قبول کیا ہے۔ آیتِ زیر بحث سے پہلے کی آیتوں میں اہل کتاب سے بہ راہ راست خطاب کیا گیا ہے۔ اس لیے دوسری توجیہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ اس موضوع پر راقم سطور نے اپنی کتاب 'قرآن، اہل کتاب اور مسلمان' (شائع شدہ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ) باب اول، فصل دوم بہ عنوان 'میثاق بنی اسرائیل' میں بحث کی ہے۔ تفصیل کے لیے اس سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔

سنت نبویؐ کا مقام

سوال: عام طور سے مقررین اور واعظین اپنے خطبوں میں ایک حدیث بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے: ''میں تمھارے درمیان دو چیزوں کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب، دوسری میری سنت۔ جب تک ان دونوں کو پکڑے رہو گے، گم راہ نہ ہو گے۔'' میرے مطالعے سے جو حدیث گزری ہے اس میں صرف ایک چیز کا ذکر ہے اور وہ ہے اللہ کی کتاب۔ بہ راہ کرم واضح فرمائیں کہ کیا دوسری چیز 'سنت' کا اضافہ کسی حدیث میں آیا ہے؟

جواب: سنن ابی داؤد میں مروی ہے کہ حجۃ الوداع کے موقعے پر اللہ کے رسول ﷺ نے، جو

خطبہ دیا تھا اس میں یہ بھی فرمایا تھا:

اِنِّیْ قَدْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَالَنْ تَضِلُّوا بَعْدَہٗ اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِہٖ، کِتَابَ اللّٰہِ. (ابو داؤد، کتاب المناسك، باب صفة حجة النبیؐ حدیث: ۱۹۰۵)

''میں تمھارے درمیان ایک ایسی چیز چھوڑ کر جا رہا ہوں، جسے اگر تم مضبوطی سے تھامے رہے تو ہرگز گم راہ نہ ہوگے۔ وہ ہے اللہ کی کتاب۔''

قریب قریب یہی الفاظ ابن ماجہ کے بھی ہیں۔ (کتاب المناسک، باب حجۃ رسول اللہ ﷺ، حدیث: ۳۰۷۴) لیکن بعض روایتوں میں کتاب اللہ کے ساتھ سنت رسول اللہ کا بھی ذکر ہے۔ حاکم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے خطبۂ حجۃ الوداع ہی کے ذیل میں یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

تَرَکْتُ فِیْکُمْ شَیْئَیْنِ لَنْ تَضِلُّوا بَعْدَ ھُمَا کِتَابَ اللّٰہِ وَ سُنَّتِی وَ لَنْ یَّتَفَرَّقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَی الْحَوْضِ.

(التیسیر بشرح الجامع الصغیر، مناوی، ۱/۴۴۷)

''میں نے تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں۔ ان کے بعد تم ہرگز گم راہ نہ ہوگے۔ وہ دو چیزیں ہیں۔ اللہ کی کتاب اور میری سنت۔ یہ دونوں جدا نہ ہوں گی، یہاں تک کہ وہ حوض کوثر پر آئیں گی۔''

اس مفہوم کی روایت مؤطا امام مالک میں بھی موجود ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

تَرَکْتُ فِیْکُمْ اَمْرَیْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا کِتَابَ اللّٰہِ وَ سُنَّةَ نَبِیِّہٖ. (کتاب القدر، باب النهی عن القول بالقدر، حدیث: ۳۸۰۱)

''میں نے تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں۔ جب تک تم ان کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے راہ راست سے نہ بھٹکو گے۔ وہ ہیں اللہ کی کتاب اور اس کے نبی ﷺ کی سنت۔''

اس سے قرآن مجید کے ساتھ حدیث اور سنت کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ یہی دین کے دو بنیادی مآخذ ہیں۔ یہ ہدایت کے وہ سرچشمے ہیں، جن سے قیامت تک رہ نمائی حاصل کی جاتی رہے گی اور اختلافات میں رجوع کیا جاتا رہے گا۔ اگر حدیث صحت کے ساتھ ثابت ہو جائے تو قرآن کے بعد اسی کا مقام ہوگا اور اسی پر اعتماد کیا جائے گا۔

حجر اسود کی تاریخی اور شرعی حیثیت

سوال: حجر اسود کے بارے میں علمی بنیاد پر اس کے مختلف پہلوؤں سے واقف ہونے کے لیے چند سوالات پیش خدمت ہیں۔ بہ راہ مہربانی ان کا جواب عنایت فرمائیے۔

(۱) حجر اسود کی تاریخی اور شرعی حیثیت کیا ہے؟

(۲) حجر اسود سب سے پہلے کس نبی کو کہاں اور کس طرح سے ملا تھا؟

(۳) حجر اسود کو سب سے پہلے خانہ کعبہ میں کس نبی نے اور کن حالات میں نصب فرمایا؟

(۴) حجر اسود سے طواف شروع کرنے کا سب سے پہلے حکم کس نبی کو دیا گیا تھا؟

(۵) بعض علماے اہل سنت، جو حجر اسود کو جنت سے اتارا ہوا پتھر نہیں مانتے اس بارے میں ان کی تحقیق اور نکتۂ نظر کیا ہے؟ اور وہ کس بنیاد پر اجماع امت اور سواد اعظم سے اختلاف کرتے ہیں؟

(۶) مشرکین مکہ بھی حجر اسود کے عقیدت مند تھے۔ حجر اسود کے بارے میں ان کا عقیدہ کیا تھا اور وہ کس بنا پر یہ عقیدہ رکھتے تھے؟

(۷) حجر اسود سے متعلق یہ معروف اور اجماعی تصور کہ وہ جنت سے اتارا ہوا پتھر ہے، کیا عقائد میں شامل ہے؟ کیا اس سے علمی اختلاف کیا جا سکتا ہے؟ اس اختلاف سے اسلام اور مسلمانوں کو کوئی حرج ہوگا؟

جواب: بیت اللہ اور مسجد حرام کی تاریخ پر متعدد کتابیں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر عربی زبان میں ملاحظہ کیجیے: اخبار مکة، ابو الولید ازرقی، مکتبہ خیاط بیروت ۱۹٦٤ اور شفاء الغرام بأخبار البلد الحرام، مکتبة النهضة الحدیثة، مکة مکرمة ۱۹٥٦۔ ان کتابوں میں بعض روایتیں ایسی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام جنت سے زمین پر بھیجے گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ حجر اسود کو بھی اتارا تھا، تاکہ وہ اس کے ساتھ مانوس رہیں۔ طوفانِ نوح کے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے اسے جبل ابوقبیس پر محفوظ رکھا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی تعمیر نو کی تو حضرت جبریل علیہ السلام نے اسے لاکر اس کی جگہ نصب کر دیا۔ تعمیر ابراہیمی کے بارے میں ازرقی نے اپنی کتاب میں، ابن جریر طبریؒ نے اپنی تفسیر

اور تاریخ دونوں میں اور دیگر مؤرخین نے ایک روایت یہ نقل کی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب خانۂ کعبہ کی تعمیر کی تو ایک پتھر کی جگہ رہ گئی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام پتھر تلاش کرنے گئے، لے کر آئے تو دیکھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام وہاں ایک دوسرا پتھر لگا چکے ہیں۔ دریافت کیا: ''ابّا جان! یہ پتھر کہاں سے آیا؟'' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا: ''یہ اس ذات نے دیا ہے، جو تمھارا محتاج نہیں ہے۔ اسے جبریل علیہ السلام آسمان سے لے کر آئے ہیں۔''

حجر اسود کے جنت سے نازل ہونے کا ذکر بعض احادیث میں بھی ہے۔ مثلاً حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ سے مرفوعاً اور موقوفاً دونوں طرح سے روایت ہے: اِنَّ الْحَجَرَ وَالْمَقَامَ یَاقُوْتَتَانِ مِنْ یَاقُوْتِ الْجَنَّةِ (حجر اور مقام جنت کے یاقوتوں میں سے ہیں) اسے احمدؒ، ترمذیؒ اور ابن حبانؒ نے روایت کیا ہے۔ دوسری روایت حضرت ابن عباسؓ سے مرفوعاً مروی ہے: نَزَلَ الْحَجَرُ الْاَسْوَدُ مِنَ الْجَنَّةِ (حجر اسود جنت سے نازل ہوا ہے)، اسے احمدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ اور ابن خزیمہؒ نے روایت کیا ہے۔ مذکورہ تاریخی روایتوں کو مستند نہیں کہا جا سکتا اور احادیث میں بھی کچھ نہ کچھ ضعف پایا جاتا ہے۔ (ملاحظہ کیجیے فتح الباری، ۴۶۲/۳)

مشرکین مکہ کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نسلی تعلق تھا۔ وہ عہد جاہلیت میں خانۂ کعبہ کے نگہبان اور منتظم تھے۔ وہ حج اور طواف کرتے تھے۔ لات و منات کی طرح حجر اسود کے سلسلے میں ان کے کسی شرکیے عقیدہ کا علم نہیں ہے۔

جہاں تک حجر اسود کی شرعی حیثیت کا سوال ہے تو اللہ کے رسول ﷺ سے ثابت ہے کہ آپؐ نے اس سے طواف شروع کیا ہے، اس کا بوسہ لیا ہے، اس کا استلام کیا ہے، یعنی اس پر ہاتھ رکھ کر ہاتھ کا بوسہ لیا ہے اور سواری پر طواف کرنے کی صورت میں اپنے ہاتھ میں کسی چیز مثلاً چھڑی وغیرہ سے اسے چھوا ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الحج: ۱۶۰۳، ۱۶۰۵، ۱۶۰۶، ۱۶۰۷، ۱۶۱۰، ۱۶۱۱، صحیح مسلم، کتاب الحج: ۱۲۶۱، ۱۲۶۸، ۱۲۷۰، ۱۲۷۲) اس بنا پر حجر اسود سے طواف شروع کرنا، اس کا بوسہ لینا اور استلام کرنا مسنون ہے۔ حجر اسود کے سلسلے میں حضرت عمر بن الخطابؓ کا تاریخی جملہ ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہنا چاہیے۔ انھوں نے ایک موقعے پر حجر اسود کا بوسہ لیا اور فرمایا:

اِنِّیْ أَعْلَمُ أَنَّکَ حَجَرٌ لاَ تَضُرُّ وَلاَ تَنْفَعُ وَ لَوْلاَ اِنِّیْ رَأَیْتُ النَّبِیَّ ﷺ یُقَبِّلُکَ مَا قَبَّلْتُکَ. (صحیح بخاری، کتاب الحج، باب ما ذکر فی الحجر الاسود)

''یقیناً میں جانتا ہوں کہ تو پتھر ہے، جو نہ نقصان پہنچا سکتا ہے نہ نفع۔ اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ لیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں کبھی تیرا بوسہ نہ لیتا۔''

ام المومنین حضرت عائشہؓ کا کم سنی میں نکاح

سوال: ایک خلش ہے، جس نے مجھے پریشان اور بے چین کر رکھا ہے۔ وہ ہے حضور ﷺ کا حضرت عائشہؓ کے ساتھ کم سنی میں شادی کرنا۔ اس سلسلے میں جو دلائل دیے جاتے ہیں ان میں کوئی وزن اور جان نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آٹھ اور نو سال کی عمر میں عرب کی لڑکی شادی کے قابل ہو جاتی ہے اور چالیس سال کے بعد ہی بوڑھی ہو جاتی ہے۔ یہ بات اس لیے صحیح نہیں ہے کہ حضورؐ نے حضرت خدیجہؓ سے چالیس سال کی عمر میں شادی کی اور بچے بھی حضرت خدیجہؓ سے چالیس سال کی عمر کے بعد ہی ہوئے ہیں۔ خود حضور ﷺ نے اپنی دختر نیک اختر حضرت فاطمہؓ کی شادی اٹھارہ سال کی عمر میں کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عائشہؓ عالمہ و فاضلہ تھیں، یہ سب صحیح، لیکن ایک ایسی لڑکی، جو کہ انتہائی کم سن ہو، جو شادی کے بعد بھی گڑیوں کا کھیل کھیلتی ہو اس سے کیا شادی کرنا ضروری تھا؟ اللہ تو کسی اور خاتون کو یہ صلاحیتیں عطا کر سکتا تھا۔ سب سے بڑا اعتراض، جو حضورؐ کے خلاف کیا جاتا ہے وہ یہی ہے کہ اپنی کبر سنی کی حالت میں حضورؐ نے کیسے ایک نو سالہ لڑکی سے شادی کی اور یہ بھی کہیں درج نہیں کہ یہ اجازت صرف حضورؐ کے لیے ہے۔ اس لیے آج اگر کوئی بوالہوس بوڑھا کم سن بچی سے شادی کرتا ہے تو اسے کون روک سکے گا؟ کہا جاتا ہے کہ اس دور میں یہ رواج تھا اس لیے کسی نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا تھا؟ مگر جو دین آخری دین تھا اور قیامت تک کے لیے تھا اس میں تو اس پر روک ہونی چاہیے تھی؟ بہ راہ کرم اس کا جواب دیں۔

جواب: رسول اللہ ﷺ کی نجی زندگی کے بارے میں جو اعتراضات کیے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ اعتراض بھی ہے کہ آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے جب نکاح کیا اس وقت ان کی عمر چھ سال اور رخصتی کے وقت نو سال تھی۔ شاید اس اعتراض سے بچنے کے لیے ہی بعض حضرات نے یہ رائے پیش کی ہے کہ حضرت عائشہؓ کی عمر نکاح کے وقت سولہ سال اور رخصتی کے وقت انیس سال تھی۔ لیکن کتبِ حدیث و سیر و تاریخ میں بہ وقتِ نکاح حضرت عائشہؓ کی کم سنی کی روایات اتنی کثرت سے ہیں کہ چھ اور نو کو سولہ اور انیس بنانا ممکن نہیں ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے زوجین کا ہم عمر ہونا پسندیدہ ہے۔ لیکن اسلام نے زیادہ اہمیت عمر کو

نہیں، بلکہ خوش گوار ازدواجی تعلقات کو دی ہے۔ قرآن وحدیث میں بیویوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے، ان کے تمام حقوق ادا کرنے، ان کی دل جوئی کرنے اور ان کے ساتھ محبت سے پیش آنے کا حکم دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ اس کا عملی نمونہ پیش کرتی ہے۔ عمروں میں تفاوت کے باوجود حضرت عائشہؓ کے ساتھ آں حضرت ﷺ کے ازدواجی تعلقات انتہائی خوش گوار اور مثالی تھے۔ نوسالہ رفاقت میں دونوں کے درمیان ناموافقت یا بے اطمینانی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ ان کے درمیان باہم الفت ومحبت کے بہت سے واقعات کتب حدیث و سیرت میں ملتے ہیں۔

عمروں میں تفاوت کے ساتھ شادیوں کا رواج صرف عہدِ قدیم ہی میں نہیں تھا۔ ایسی شادیاں ہر دور میں ہوتی رہی ہیں اور آج کل بھی ایسی خبریں اخباروں کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ مگر ان کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہوتی۔ ابھی حال میں رائٹر نامی خبر رساں ایجنسی نے چین کے بیاسی سالہ نوبل انعام یافتہ ماہر طبیعیات ڈاکٹر چینگ ننگ ینگ کی اپنی اٹھائیس سالہ طالبہ وونگ فین سے شادی کی خبر دی ہے۔ ڈاکٹر ینگ نے اپنی ہونے والی دلہن کو اپنے لیے اللہ کا آخری تحفہ قرار دیا ہے اور اٹھائیس سالہ دوشیزہ نے بھی اپنی اس شادی پر خوشی کا اظہار کیا ہے۔

(ماہ نامہ اللہ کی پکار، نئی دہلی، فروری ۲۰۰۵ء ص: ۱۰۰)

نکاحِ عائشہؓ پر اعتراض کے پیچھے ایک ذہنیت یہ کام کرتی ہے کہ اتنی کم سن لڑکی اس قابل نہیں ہوتی کہ اس سے مخصوص ازدواجی تعلق قائم کیا جاسکے۔ اس ذہنیت کے حاملین یہ بھول جاتے ہیں کہ بلوغ کی کوئی حد مقرر نہیں کی جاسکتی۔ اسی طرح عورت کی پیداواری صلاحیت کی انتہائی مدت متعین کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ جسمانی نشو ونما، غذائیت، آب وہوا، خاندان اور دیگر عوامل اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یورپی ممالک میں آٹھ، نو سال کی عمر میں لڑکیوں کے یہاں ولادت کی متعدد خبریں منظر عام پر آئی ہیں اور ابھی حال میں ایک باسٹھ سالہ خاتون کے ماں بننے کی خبر اخباروں میں چھپی ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ کی کم سنی کی شادی پر اعتراضات کا جائزہ کسی قدر تفصیل سے راقم سطور نے اپنی کتاب 'حقائق اسلام (بعض اعتراضات کا جائزہ)' میں لیا ہے، جسے مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ کم سنی کی شادی کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر جاننے کے لیے مولانا سلطان احمد اصلاحی کے رسالہ 'کم سنی کی شادی اور اسلام' کا مطالعہ مفید ہوگا۔ یہ رسالہ بھی مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی سے شائع ہوا ہے۔

سوال: عمر عائشہؓ کے حوالے سے آپ کا جواب نظر سے گزرا۔ غالباً اس حوالے سے جناب حکیم نیاز احمد کی کتاب 'کشف الغمۃ' مولانا حبیب الرحمٰن کاندھلوی، علامہ تمنا عمادی، جناب رحمت اللہ طارق اور علامہ محمود احمد عباسی کی تحریروں کو سامنے نہیں رکھا گیا ہے۔ شاید آپ کے زیر مطالعہ رہی ہوں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ جناب حکیم نیاز احمد کے دلائل کافی مضبوط ہیں۔ اگر ممکن ہو تو اس حوالے سے تھوڑی تسلی کرادیں۔

جواب: ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی عمر کے سلسلے میں جمہورِ امت کا نقطۂ نظر یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے نکاح کے وقت ان کی عمر چھ سال اور رخصتی کے وقت نو سال تھی۔ تاریخ، سیرت النبی، سیر الصحابہ، طبقات اور دیگر علوم کی قدیم کتابوں میں مختلف راویوں سے اس کی صراحت ملتی ہے۔ البتہ ماضی قریب کے بعض محققین کی رائے ہے کہ نکاح کے وقت ام المومنین کی عمر سولہ سال اور رخصتی کے وقت انیس سال تھی۔ آپ نے ان میں سے بعض حضرات کے نام درج کردیے ہیں۔ مولانا محمد فاروق خاں کا بھی اس موضوع پر ایک مختصر رسالہ ہے۔ وہ بھی ان محققین کے ہم خیال ہیں۔ اس سلسلے میں اصولی طور پر چند باتیں عرض ہیں:

(۱) اس موضوع کا تعلق دین کی اساسیات سے نہیں ہے، بلکہ یہ ایک تاریخی مسئلہ ہے۔ اس لیے دونوں آرا میں سے، جس پر بھی اطمینان ہو، اسے اختیار کرلینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(۲) نئی تحقیق اس زمانے میں پیش کی گئی جب غیروں کی طرف سے رسول اکرم ﷺ کی ازدواجی زندگی کو ہدفِ تنقید بنایا جانے لگا اور خاص طور پر ام المومنین کی کم سنی اور ان کی اور رسول اللہ ﷺ کی عمروں میں تفاوت کو بہت زیادہ نمایاں کیا جانے لگا۔ اس تحقیق سے بھی ان لوگوں کو مطمئن اور خاموش نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کہ انیس سال کی عمر میں رخصتی مان لینے کی صورت میں بھی اس وقت رسول اللہ ﷺ کی عمر ۵۶ سال تھی اور اس تفاوت کو بھی جدید زمانے کے لوگ بہت زیادہ مانتے ہیں۔

(۳) نئی تحقیق پیش کرنے والوں کی تحریروں میں غالباً اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا کہ اگر نکاح کے وقت ام المومنین کی عمر سولہ سال تھی تو رخصتی کو مزید تین سال موخر کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ نکاح کے بعد رخصتی فوراً ہو جانی چاہیے تھی اور اس زمانے کا یہی دستور بھی تھا۔

(۴) زوجین کا ہم عمر ہونا متعدد پہلوؤں سے مفید، مطلوب اور پسندیدہ ہے۔ قرآن وسنت میں

اس کے اشارے موجود ہیں۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ کا معاملہ ایک استثناء ہے، جس کے مختلف مصالح تھے۔ اس کی تفصیل متعلقہ موضوع کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

کیا آں حضرت ﷺ نے بعض خواتین کو طلاق دی ہے؟

سوال: ایک رسالے میں ایک واقعہ نظر سے گزرا کہ حضور پاک ﷺ نے اسماء بنت نعمان نامی خاتون سے شادی کی، پھر خلوت سے پہلے طلاق دے دی اور بعد میں اسماء بنت نعمان نے نکاح ثانی کرلیا۔ مذکورہ واقعہ پڑھ کر حد درجہ حیرانی و پریشانی ہوئی، کیوں کہ حضور اقدسؐ کی نسبت سے یہ قصہ بالکل ناقابل فہم محسوس ہوتا ہے۔ بعض مقامی علماء کرام سے ذکر کیا تو وہ بھی ناقابل فہم بتلاتے ہیں۔ لہٰذا میں بہت کرب و بے چینی کے عالم میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس واقعے کی تحقیق کر کے جواب سے مشکور فرمائیں۔

جواب: آپ کے مکتوب سے یہ واضح نہیں ہوسکا کہ اس واقعے کو پڑھ کر آپ کو کیوں حیرانی و پریشانی ہوئی؟ مخالفین اسلام نے آں حضرت ﷺ کی ازدواجی زندگی پر اعتراضات کیے ہیں اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ آپ کی کثرتِ ازواج کا سبب نعوذ باللہ آپ کی شہوت پرستی تھی۔ یہ بات وہ ایک ایسی ہستی کے بارے میں کہتے ہیں، جس کی جوانی عفت و عصمت کا نمونہ تھی، جس نے پچیس سال کی عمر میں ایک چالیس سالہ خاتون سے نکاح کیا پھر پورے پچیس سال صرف اسی کے ساتھ گزار دیے، اس کی وفات کے بعد پھر اپنی ہم عمر ایک بوڑھی خاتون سے نکاح کیا اور جس کے بیش تر نکاح عمر کے آخری چار پانچ سال میں ہوئے تھے۔ (آں حضرت ﷺ کی ازواج مطہرات کی کثرت کے حِکَم و مصالح اور آپ کی ازدواجی زندگی پر دیگر اعتراضات کا جائزہ میں نے اپنے ایک مقالے میں لیا ہے، جو میری کتاب 'حقائق اسلام' (شائع شدہ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی) میں شامل ہے۔

آپ کی حیرانی و پریشانی کی وجہ بہ ظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ مذکورہ واقعہ سے تاثر ملتا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے مذکورہ خاتون سے نکاح کرنے کے بعد بغیر کسی وجہ کے انھیں طلاق دے دی تھی، حالاں کہ بات یہ نہیں ہے۔ یہ خاتون قبیلۂ کندہ کے سردار نعمان بن شراحیل بن اسود بن جون کی صاحب زادی تھیں۔ نعمان نے ۹ھ میں خدمت نبوی میں حاضر ہوکر اسلام قبول کیا تو یہ بھی عرض کیا کہ میری بیٹی عرب کی حسین ترین عورتوں میں سے ہے۔ میں نے اپنے بھتیجے سے اس

کا نکاح کر دیا تھا۔ وہ بیوہ ہوگئی ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ اس سے نکاح کر لیں۔ آپؐ نے رضامندی ظاہر فرمائی اور حضرت ابو اسید ساعدیؓ کو اسے لانے کے لیے بھیجا۔ حضرت ابو اسیدؓ نے اسے لا کر قبیلۂ بنو ساعدہ کے ایک گھر میں اتارا۔ (فتح الباری ۹/۳۵۹ بہ حوالہ ابن سعد) صحیح بخاری میں ہے کہ آپؐ اس کے پاس تشریف لے گئے۔ آپ کے ساتھ خلوت پر اس نے ناگواری کا اظہار کیا اور بعض ایسی باتیں کہیں، جن سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اسے آپ کی زوجیت منظور نہیں۔ آپؐ باہر نکل آئے اور متعۂ طلاق کا جوڑا عنایت کر کے اسے اس کے قبیلے میں واپس بھجوا دیا۔ اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت ﷺ اس خاتون سے نکاح پر محض اس کے باپ کی خواہش اور اس کی بیوگی پر از راہ ہمدردی تیار ہو گئے تھے، لیکن جب اس کی طرف سے اظہار ہوا کہ اسے آپ کی زوجیت منظور نہیں تو اسے طلاق دے دی۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں عورت کو کتنی آزادی دی گئی ہے کہ وہ پیغمبر سے نکاح سے بھی انکار کر سکتی ہے۔

یہ واقعہ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، باب من طلق و هل يواجه الرجل امرأته بالطلاق (۵۲۵۵، ۵۲۵۶، ۵۲۵۷) میں تفصیل سے مذکور ہے۔ اس کے علاوہ سنن ابن ماجہ، ابواب الطلاق، باب ما يقع به الطلاق (۲۰۵۰) اور مسند احمد، جلد ۳، ص: ۴۹۸، جلد ۵، ص: ۳۳۹ میں بھی مروی ہے۔ مذکورہ خاتون کے نام میں بہت اختلاف ہے۔ امام بخاریؒ نے ایک جگہ امیمہ بنت نعمان اور دوسری جگہ امیمہ بنت شراحیل لکھا ہے۔ ابن ماجہ میں ایک جگہ ابنۃ الجون اور دوسری جگہ عمرۃ بنت الجون ہے۔ مسند احمد میں ایک جگہ امیمہ اور دوسری جگہ امیۃ آیا ہے۔ محمد بن اسحاق، محمد بن حبیب اور بعض دیگر حضرات نے اسماء بنت نعمان ذکر کیا ہے۔ بعض دیگر نام بھی ملتے ہیں۔ علامہ ابن حجر نے دونوں میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے اور لکھا ہے کہ شاید ان کا نام اسماء اور لقب امیمہ ہو۔ بہ ہر حال، یہ واقعہ صحیح احادیث سے ثابت ہے۔

عموماً اصحاب سیر نے آں حضرت ﷺ کی ازواج مطہرات کی تعداد گیارہ بتائی ہے۔ یہ وہ خواتین ہیں، جنھیں کچھ عرصہ آں حضرت ﷺ کی زوجیت و رفاقت میں رہنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ یہ امت کی مائیں ہیں۔ آں حضرت ﷺ کے وصال کے بعد ان سے اللہ تعالیٰ کو دین کی تعلیم و تبلیغ کی اہم خدمت لینی تھی۔ دوسرے انھیں آں حضرت ﷺ سے خاص تعلق ہونے کی وجہ سے افرادِ امت کے دلوں میں ان کے بارے میں انتہائی عزت و احترام کا جذبہ پایا جاتا تھا۔ ان وجوہ سے ان سے نکاح حرام قرار دیا گیا۔ ان کے علاوہ کتبِ سیرت میں بعض ایسی

خواتین کے نام ملتے ہیں، جنھیں آں حضرت ﷺ نے پیغام نکاح دیا، لیکن کسی وجہ سے نکاح نہیں ہو پایا، ان سے نکاح تو ہو گیا لیکن خلوت سے قبل ہی بعض اسباب سے ان سے علیٰحدگی اختیار کر لی۔ علامہ ابن قیمؒ نے ایسی خواتین کی تعداد چار یا پانچ بتائی ہے۔ (زاد المعاد، ۱/۱۱۴) ایسی خواتین کا شمار ازواجِ نبی اور امہات المومنین میں نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر بعض صحابہ نے ان سے نکاح کر لیا تھا۔

کیا روز قیامت تمام لوگ ہلاک ہو جائیں گے؟

سوال: ایک تعزیتی مجلس میں ایک صاحب نے کہا کہ قیامت کے دن سب چیزیں ہلاک ہو جائیں گی اور فرشتے بھی ان میں شامل ہیں۔ انھوں نے سورۂ قصص کی آخری آیت کا حوالہ دیا۔ میں نے آخرت کے بارے میں پہلے بھی کچھ پڑھا تھا اور اس واقعے کے بعد بھی 'مناظر قیامت' از سید قطب شہید، 'آخرت' از بنت الاسلام اور دیگر کتب کا مطالعہ کیا مگر جواب نہیں مل سکا۔ ادھر قرآن کی دو آیات (سورۂ زمر کی آیت ۶۸ اور سورۂ نمل کی آیت ۸۷) نے شش و پنج میں ڈال دیا، جہاں تذکرہ ہے کہ روز قیامت تمام مخلوق بے ہوش ہو کر گر پڑے گی (اور مر جائے گی، جیسا کہ تفہیم القرآن اور بیان القرآن از علامہ تھانویؒ میں ہے) سوائے چند کے۔ ہمارے کشمیری مفسر مولانا یوسف شاہؒ نے لکھا ہے کہ 'سوائے چند' سے مراد حدیث کے مطابق چار بڑے فرشتے یعنی جبرئیل، میکائیل، عزرائیل اور اسرافیل ہیں۔ لیکن سورۂ قصص کی آخری آیت میں ہر شے کے ہلاک ہونے کا تذکرہ ہے، تو پھر تطبیق کیسے ہو؟ میں نے سید قطب کی 'مناظر قیامت' کا مطالعہ کیا کہ شاید اس میں سورۂ قصص کی مذکورہ آیت کا کہیں ذکر ہو، مگر اس میں اس آیت کا کہیں تذکرہ نہیں۔ گویا یہ آخرت کے بارے میں ہے ہی نہیں۔ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر یہ آیت آخرت کے بارے میں ہوتی تو سید قطب اس کا حوالہ کیوں نہ دیتے؟ برائے مہربانی ایک عالم ہونے کے ناطے آپ میری یہ ذہنی خلش دور فرمائیں۔

اس کے علاوہ قیامت کے فیصلے کے بعد موت کے فرشتے حضرت عزرائیل کو اہل بہشت اور اہل دوزخ کے سامنے لا کر اس کے ذبح کرنے کے متعلق ایک خطیب سے سنا ہے، جو کہتے تھے کہ اس ذبح سے جنتیوں کو یہ خوش خبری دینا مراد ہے کہ اب آپ کو جنت سے کوئی نہیں نکال سکتا۔ اسی طرح جہنمیوں کو یہ بری خبر دینا کہ اس جہنم سے اب تم کو کوئی نہیں چھڑا سکتا، کیوں کہ موت کا فرشتہ ذبح ہوا ہے۔ اس کی اصل کیا ہے؟ اس کی وضاحت چاہتا ہوں۔

جواب: سورۂ قصص کی آخری آیت میں ہے: كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ اس کا سیدھا سا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ ہر چیز کو فنا ہونا ہے۔ صرف اسی کی ذات کو ابدیت حاصل ہے۔ اس مفہوم کی متعدد آیات قرآن میں ہیں، مثلاً:

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ (آل عمران:۱۸۵) ''آخر کار ہر شخص کو مرنا ہے۔''

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ (الرحمٰن:۲۶) ''ہر چیز جو اس زمین پر ہے فنا ہو جانے والی ہے اور صرف تیرے رب کی جلیل و کریم ذات ہی باقی رہنے والی ہے۔''

اس آیت کا تعلق دنیا سے ہے۔ یعنی دنیا میں جتنے جان دار ہیں، سب کو ایک نہ ایک دن مرنا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے اس کی تفسیر میں ایسا ہی قول مروی ہے:

كُلُّ حَيٍّ مَيِّتٌ اِلَّا وَجْهَهٗ یعنی ہر جان دار کو مرنا ہے سوائے اس (اللہ) کی ذات کے۔ (روح المعانی:۲۰/۱۳۱)

چوں کہ فرشتے بھی جان دار مخلوق ہیں، اس لیے اس آیت کا اطلاق ان پر بھی ہونا چاہیے۔ ابن مردَوَیہ نے حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ جب آیت كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ نازل ہوئی تو کسی نے سوال کیا: کیا فرشتوں پر بھی موت طاری ہوگی؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ۔ معلوم ہوا کہ ملائکہ، جن و انس، حیوانات اور تمام ذوی الارواح کو موت آئے گی۔ (روح المعانی ۲۰/۱۳۱)

آپ نے سورۂ نمل اور سورۂ زمر کی آیات کا حوالہ دیا ہے؛ وہ آیات یہ ہیں:

وَ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ (النمل:۸۷)

''اور کیا گزرے گی اس روز جب کہ صور پھونکا جائے گا اور ہول کھا جائیں گے وہ سب، جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، سوائے ان لوگوں کے، جنھیں اللہ اس ہول سے بچانا چاہے گا۔''

وَ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ (الزمر:۶۸)

''اور اس روز صور پھونکا جائے گا اور وہ سب مر کر گر جائیں گے، جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، سوائے ان کے جنھیں اللہ زندہ رکھنا چاہے۔''

سورۂ نمل میں 'نفخ صور' کے نتیجے میں آسمان وزمین کی تمام مخلوقات کے 'فزع' اور سورۂ زمر میں ان کے 'صعق' کا ذکر ہے۔ دونوں آیتوں میں ''اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ'' کے ذریعے بعض افراد کو اس کیفیت سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے بعض مفسرین کا خیال ہے کہ 'فزع اور صعق' ایک ہی کیفیت کی دو مختلف تعبیریں ہیں۔ لیکن علامہ ابن کثیرؒ نے دونوں کو علیٰحدہ علیٰحدہ کیفیتیں قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک وقتِ قیامت پہلی مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو تمام مخلوقات پر فزع (گھبراہٹ) کی کیفیت طاری ہوگی۔ (تفسیر القرآن العظیم، ۳/ ۴۹۷) اس سے کچھ افراد مستثنیٰ ہوں گے۔ یہ کون لوگ ہوں گے؟ ان کا تذکرہ سورۂ نمل کی اگلی آیت ۸۹ ہی میں ہے: مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَ هُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ ۝ (جو شخص بھلائی لے کر آئے گا، اسے اس سے زیادہ بہتر صلہ ملے گا اور ایسے لوگ اس دن کے ہول سے محفوظ ہوں گے) اسی طرح اللہ کے نیک بندوں کا تذکرہ سورۂ انبیاء آیت ۱۰۳ میں یوں ہے: لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ (وہ انتہائی گھبراہٹ کا وقت ان کو ذرا پریشان نہ کرے گا)۔

دوسری مرتبہ صور پھونکے جانے کا ذکر سورۂ زمر کی آیت ۶۸ میں ہے۔ اس وقت آسمان و زمین کی تمام مخلوقات پر 'صعق' کی کیفیت (یعنی موت) طاری ہوگی۔ بعض افراد اس کیفیت سے بھی مستثنیٰ رہیں گے۔ احادیث میں اس کی صراحت نہیں ہے کہ یہ کون لوگ ہوں گے؟ بعض حضرات نے ان سے حضرت جبرئیل، حضرت میکائیل، حضرت اسرافیل اور ملک الموت مراد لیے ہیں۔ بعض نے ان میں حملۃ العرش یعنی عرش الٰہی کو اٹھانے والے فرشتوں کو بھی شامل کیا ہے اور بعض کے نزدیک انبیاء وشہدا بھی مراد ہیں۔ (تفسیر مولانا شبیر احمد عثمانی)

ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ تمام زندہ بچ جانے والوں کی روحیں قبض کر لے گا، یہاں تک کہ سب سے آخر میں ملک الموت پر بھی موت طاری ہو جائے گی اور صرف اللہ تعالیٰ کی تنہا ذات رہ جائے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ سب سے پہلے حضرت اسرافیل علیہ السلام کو زندہ کرے گا اور انھیں صور پھونکنے کا حکم دے گا۔ یہ تیسرا نفخہ ہوگا، جس پر تمام مخلوقات زندہ ہو کر میدان حشر میں اللہ کے حضور اکٹھا ہوں گی۔ اس کا تذکرہ اس آیت میں ہے:

ثُمَّ نُفِخَ فِيهِ أُخْرَىٰ فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنظُرُونَ (الزمر:۶۸)

''پھر ایک دوسرا صور پھونکا جائے گا اور یکا یک سب کے سب اٹھ کر دیکھنے لگیں گے۔''

(تفسیر القرآن العظیم،۴/۸۰۱)

صور کتنی مرتبہ پھونکا جائے گا؟ اس سلسلے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے دو، بعض نے تین، بعض نے چار اور بعض نے اس سے زائد مرتبہ نفخ صور کا تذکرہ کیا ہے۔

اس تشریح سے واضح ہوا کہ سورۂ نمل اور سورۂ زمر کی آیات کا اپنا اپنا موقع ومحل ہے اور ایک وقت ایسا بھی ہوگا جب سورۂ قصص کی آخری آیت (۸۸) کے بہ موجب تمام مخلوقات پر موت طاری ہوگی۔

جنت وجہنم کی ابدیت کے سلسلے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے، وہ صحیح ہے۔ بس اتنی ترمیم کر لیجیے کہ اہل جنت اور اہل جہنم کے سامنے موت کے فرشتے کو نہیں، بلکہ موت کو ایک مینڈھے کی شکل میں لاکر ذبح کر دیا جائے گا۔ یہ گویا اس بات کی علامت ہوگی کہ اب کسی کو موت نہ آئے گی۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

''موت کو ایک بھورے رنگ کے مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا۔ اس کے ساتھ ایک منادی کرنے والا ہوگا جو پکارے گا: ''اے جنت کے باسیو!'' اہل جنت اپنے بالا خانوں سے جھانکیں گے۔ منادی کرنے والا پوچھے گا: ''کیا اسے پہچانتے ہو؟'' وہ کہیں گے: ''ہاں، یہ موت ہے۔'' ہر جنتی اسے دیکھ لے گا۔ پھر منادی کرنے والا پکارے گا: ''اے جہنمیو!'' اس کی پکار پر تمام جہنمی اس کی طرف دیکھیں گے۔ وہ پوچھے گا: ''کیا اسے پہچانتے ہو؟'' وہ کہیں گے: ''ہاں یہ موت ہے؟'' پھر وہ اس مینڈھے کو ذبح کر دے گا۔ اس کے بعد اعلان کرے گا: ''اے اہل جنت! اب تمھارے لیے ہمیشگی ہے۔ اب تمھیں کبھی موت نہ آئے گی۔ اور اے اہل جہنم! اب تمھارے لیے بھی ہمیشگی ہے۔ اب تمھیں کبھی موت نہ آئے گی۔'' اس کے بعد آں حضرت ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

وَ اَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ (مریم:۳۹)

''اے نبیؐ! اس حالت میں جب کہ یہ لوگ غافل ہیں اور ایمان نہیں لا رہے ہیں؛ انھیں اس دن سے ڈراؤ جب کہ فیصلہ کر دیا جائے گا اور پچھتاوے کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔''

(صحیح بخاری، کتاب التفسیر، حدیث: ۴۷۳۰، صحیح مسلم، کتاب الجنۃ، حدیث: ۲۸۴۹ یہ حدیث جامع ترمذی، سنن دارمی اور مسند احمد میں بھی مروی ہے)

بعض مقاماتِ قرآنی کی تحقیق

سوال: قصۂ موسیٰ وفرعون سے تعلق رکھنے والی آیات کی، جو تشریح مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے بیان فرمائی ہے، اس سے میرے دل میں کئی سوالات پیدا ہو گئے ہیں۔ گزارش ہے کہ تحقیق کر کے ان کے جوابات مرحمت فرمائیں، تاکہ میرے اشکالات کا ازالہ ہو سکے۔ مناسب سمجھیں تو میرے سوالات اور اپنے جوابات کو شائع بھی فرما دیں، تاکہ اس مباحثے سے عام لوگوں کو بھی فائدہ ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ کی علمی جدوجہد کو قبول فرمائے اور دنیا و آخرت کی نعمتوں سے نوازے۔

(۱) مولانا مودودیؒ صحرائے سینا پر فرعون کے تسلط کے تعلق سے سورۂ اعراف میں بیان کرتے ہیں کہ ''اس زمانے میں جزیرہ نمائے سینا کا مغربی اور شمالی حصہ مصر کی سلطنت میں شامل تھا۔ جنوب کے علاقے میں موجودہ شہر طور اور ابوزنیمہ کے درمیان تانبے اور فیروزے کی کانیں تھیں، جن سے اہلِ مصر بہت فائدہ اٹھاتے تھے اور ان کانوں کی حفاظت کے لیے مصریوں نے چند مقامات پر چھاؤنیاں قائم کر رکھی تھیں۔ انھی چھاؤنیوں میں سے ایک چھاؤنی مفقہ کے مقام پر تھی جہاں مصریوں کا ایک بہت بڑا بت خانہ تھا، جس کے آثار اب بھی جزیرہ نما کے جنوبی مغربی علاقے میں پائے جاتے ہیں۔'' (تفہیم القرآن، ج۲، ص۷۴، ح۹۸) جب کہ سورۂ قصص کی تفسیر میں مولانا تحریر فرماتے ہیں: ''مصر کی حکومت پورے جزیرہ نمائے سینا پر نہ تھی، بلکہ صرف اس کے مغرب اور جنوبی علاقے تک محدود تھی۔'' (تفہیم القرآن، ج۳، ص۶۲۶، ح۳۲)

سوال یہ ہے کہ فرعون کا تسلط صحرا کے شمال اور جنوب دونوں پر تھا، یا شمالی حصے کے علاوہ جنوب کے صرف مغربی حصہ پر تھا؟ اگر پورے جنوب پر فرعون کا قبضہ نہیں تھا تو جنوبی سینا کے شہر طور اور ابوزنیمہ کے درمیان کی کانوں سے فائدہ اٹھانے کا اختیار مصریوں کو کیسے حاصل ہوا؟

مولانا نے کسی بت خانہ کے آثار کی نشان دہی، جس جنوبی مغربی علاقے میں کی ہے، اس سے مراد کون سا علاقہ ہے؟

(۲) مولانا مودودیؒ نے سورۂ یوسف کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ''حضرت یوسفؑ نے حضرت یعقوبؑ کو اپنے پورے خاندان کے ساتھ فلسطین سے مصر بلا لیا اور اس علاقے میں آباد کیا، جو دمیاط اور قاہرہ کے درمیان واقع ہے۔ بائبل میں اس علاقے کو جشن یا گوشن بتایا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک یہ لوگ اسی علاقے میں آباد رہے۔'' (تفہیم القرآن، ج ۲، ص ۳۸۲-۳۸۳) تفہیم القرآن ج ۱، ص ۴۶۰ کے مقابل مولانا نے، جو نقشہ دیا ہے اس کے نیچے یہ وضاحت ہے کہ ''حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر جزیرہ نمائے سینا میں مارہ، ایلیم اور رفیدیم کے راستے کوہ سینا کی طرف آئے اور ایک سال سے کچھ زائد مدت تک اس مقام پر ٹھہرے رہے۔'' نقشے میں بھی مولانا نے ان مقامات کی نشان دہی کی ہے۔ بائبل میں بھی یہی باتیں بتائی گئی ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کس دریا کو عبور کیا تھا (اور اس میں فرعون غرق ہوا تھا) اس تعلق سے مولانا سورۂ اعراف میں فرماتے ہیں: ''جس مقام سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریا کو عبور کیا وہ غالباً موجودہ سوئز اور اسماعیلیہ کے درمیان کوئی مقام تھا۔ یہاں سے گزر کر یہ لوگ جزیرہ نمائے سینا کے جنوبی علاقے کی طرف ساحل کے کنارے کنارے روانہ ہوئے۔''

(تفہیم القرآن، ج ۲، ص ۴۷، ح ۹۸)

جس دریا میں فرعون غرق ہوا تھا، بائبل میں اس کا نام بحر قلزم بتایا گیا ہے۔ موجودہ دور میں اس دریا کو، جو سویز کے علاقے میں بہتا ہے، بحر قلزم نہیں، بلکہ خلیج سویز کہا جاتا ہے۔ بحر قلزم سویز اور اسماعیلیہ سے کافی دور ہے۔ تفہیم القرآن اور بائبل میں، جن مقامات کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً مارہ، ایلیم اور رفیدیم وغیرہ وہ بحر قلزم سے بہت دور واقع ہیں۔ بحر قلزم کی جانب سے کوہ سینا پہنچنے کے لیے ان مقامات کی طرف آنے کی ضرورت بھی نہیں۔ جس دریا میں فرعون غرق ہوا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ساتھ اسے پار کر گئے تھے، اگر قدیم زمانے میں اس کو بحرِ قلزم ہی کہا جاتا تھا تو آئندہ نسل کی رہ نمائی کے لیے کم از کم قوسین میں خلیج سویز لکھنا چاہیے۔ یہ ہماری رائے ہے۔

(۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام نبوت سے قبل ایک غیر ارادی قتل کی سزا سے بچنے کے لیے مدین چلے گئے تھے۔ اس کے ضمن میں مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں: ''اس زمانے میں مدین فرعون کی سلطنت سے باہر تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مدین کا رخ اس لیے کیا تھا کہ وہ قریب ترین اور آزاد و آباد علاقہ تھا۔ (تفہیم القرآن، ج ۳، ص ۶۲۶) آگے فرماتے ہیں: ''حضرت موسیٰ علیہ السلام بے سروسامانی کے عالم میں یکا یک مصر سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ مدین تک کم از کم ۸ دن میں پہنچے ہوں گے۔'' (تفہیم القرآن، ج ۳، ص ۶۲۹)

چوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سفر مدین میں دریا کا ذکر نہیں ہے، اس وجہ سے ہمارا خیال ہے کہ انھوں نے اس برّی راستے ہی سے اپنے سفر کا آغاز کیا ہوگا، جو فلسطین کو مصر (اسماعیلیہ) کے آس پاس سے ملاتا ہے اور جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بعد حضرت یعقوبؑ اور ان کی اولاد نے مصر میں داخل ہونے کے لیے اختیار کیا تھا۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکل کر سینا کے مشرقی حصے تک پہنچے ہوں گے اور پھر وہاں سے سیدھے سینا کے جنوب کی راہ اختیار کر کے خلیج عقبہ کے اطراف آباد اصحاب مدین میں جا کر شامل ہو گئے۔

ارضِ مدین اور کوہِ سینا دونوں متصل علاقے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے، جو راستہ اختیار کیا، جس کے درمیانی مقامات مارہ، ایلیم اور رفیدیم تھے، وہی کوہِ سینا تک پہنچنے کا قریب ترین راستہ ہے۔ شمالی سینا کا برّی راستہ طے کر کے جنوبی سینا کی طرف سے ارض مدین پہنچنا کافی طویل معلوم ہوتا ہے۔ اس طویل مسافت کو حضرت موسیٰ علیہ السلام آٹھ دنوں میں کیسے طے کر سکتے ہیں؟ جب کہ بنی اسرائیل کو بیابانِ سینا (کوہِ طور) تک پہنچنے میں، جو اس سے کم فاصلہ ہے، بائبل کے بیان کے مطابق تین ماہ لگے۔ (کتاب خروج، باب ۱۹: ۱-۲)

ممکن ہے بنی اسرائیل نے عورتوں اور بچوں کی وجہ سے درمیان میں قیام زیادہ کیا ہو اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قیام کیے بغیر اپنا سفر جاری رکھا ہو۔ پھر بھی اس قدر طویل مسافت کو محض آٹھ دنوں میں طے کرنے کی بات تحقیق و وضاحت طلب ہے۔

جواب:

(۱) مصر کی قدیم تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر متعدد خاندانوں

نے حکم رانی کی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں، جو خاندان حکومت کر رہا تھا وہ 'انیسویں خاندان' کے نام سے معروف تھا۔ اس کا زمانہ ۱۳۵۰ ق م سے ۱۲۰۵ ق م تک تھا۔ اس خاندان کے حکم رانوں میں رمسیس دوم اور منفتاح شہرت رکھتے ہیں۔ رمسیس دوم نے ۱۲۹۲ ق م سے ۱۲۲۵ ق م تک حکم رانی کی ہے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ مصر کے عظیم ترین حکم رانوں میں سے تھا۔ اس نے پورے ملک میں مختلف عمارتیں اور عبادت خانے بنوائے، اس بنا پر اسے غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ اس کا زیادہ تر عرصۂ حکومت جنگ میں گزرا۔ حیثیوں نے شام کے بڑے حصے پر قبضہ کرلیا تھا۔ رمسیس دوم تقریباً دو دہائیوں تک ان سے برسرِ پیکار رہا۔ یہاں تک کہ اس کا قبضہ بحال ہوگیا۔ پھر دونوں میں مصالحت ہوگئی اور جنگ سے نجات ملی۔ اس نے فلسطین کو سرنگوں کیا۔ بلاد النہرین پر حملہ کر کے اس کے بڑے حصے کو فتح کرلیا۔ رمسیس نے اپنے زمانے میں نہ صرف یہ کہ بعض ان علاقوں پر اپنا قبضہ بحال کیا، جن پر دوسرے قابض ہوگئے ہیں بلکہ اپنے حدود مملکت میں بھی اضافہ کیا۔ اس کے عہد میں مصر کے حدود جنوب میں جنادل اربعہ سے قریب نباتا تک پہنچ گئے تھے اور بلاد النوبۃ تک اس کا اقتدار وسیع ہوگیا تھا۔ اس کے زمانے میں تنیس ایک عظیم ترقی یافتہ شہر بن گیا تھا۔ وہاں رمسیس نے ایک عظیم الشان معبد تعمیر کروایا تھا۔ رمسیس نے سمندر کے کنارے کنارے متعدد نئے شہر بسائے تھے۔ ان میں سے ایک شہر عین شمس کے شمال میں تھا، جس کے آثار اب 'تلّ الیہودیہ' کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

رمسیس دوم کا جانشین اس کا بیٹا منفتاح ہوا۔ اس نے ۱۲۱۵ ق م تک حکومت کی۔ اس نے بھی اپنے اقتدار کی حفاظت کے لیے متعدد جنگیں کیں۔ فلسطین اور شام میں ہونے والی بغاوتوں کو کچلا۔ لوبیوں کے حملوں کا جواب دیا، جو مغرب کی جانب سے مصر پر یلغار کر رہے تھے۔ منفتاح بھی عمارتوں کا شوقین تھا۔ اس نے بھی متعدد عمارتیں اور عبادت خانے تعمیر کیے۔ کہا جاتا ہے کہ منفتاح ہی وہ فرعونِ موسیٰ ہے، جس کے عہدِ حکومت میں بنو اسرائیل مصر سے نکلے تھے۔

یہ معلومات مصر کی تاریخ پر ایک عربی کتاب تاریخ مصر الی الفتح العثمانی تالیف عمر الاسکندری، مطبعۃ المعارف مصر، ۱۹۲۱ ص ٤٥-٥٤ سے حاصل کی گئی ہیں۔ مصر کی قدیم تاریخ پر میں نے اور بھی کتابیں دیکھی ہیں، جو عربی زبان میں مصر

سے شائع ہوئی ہیں۔ مثلاً تاریخ مصر، ہند اسکندر عمّون، مطبعة المعارف مصر، ۱۹۱۳ء مصر، ڈاکٹر نجیب میخائیل ابراهیم، دار المعارف، مصر، ۱۹۵۸ء علی هامش التاریخ المصری القدیم، عبد القادر حمزة، مطابع الشعب مصر ۱۹۵۷ء مصر و مجدها الغابر، مرجربت مری، ترجمه محرم کمال، لجنة البیان العربی ۱۹۵۷ء، موخر الذکر کتاب Margaret A. Murray کی انگریزی کتاب The Splendour that was Egypt کا ترجمہ ہے۔

اوپر جو تفصیل بیان کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں خاندان کا اقتدار مصر کے علاوہ اطراف کے علاقوں فلسطین، شام اور جزیرہ نمائے سینا پر بھی تھا۔ البتہ مسلسل جنگوں کے نتیجے میں حدودِ مملکت میں کمی اور زیادتی ہوتی رہتی تھی۔ اس بنا پر عین ممکن ہے کہ مصریوں کا اقتدار جزیرہ نمائے سینا کے کچھ شمالی حصوں پر بھی رہا ہو اور کچھ جنوبی حصوں پر بھی۔ مولانا مودودیؒ نے سورۂ اعراف کی تفسیر میں جزیرے کے شمالی حصے پر اور سورۂ قصص کی تفسیر میں اس کے جنوبی حصے پر اہلِ مصر کے اقتدار کی بات کہی ہے۔

(۲) مصر اور فلسطین کے درمیان آمد و رفت کے دو راستے ہیں۔ ایک خشکی کا راستہ، جو مشرق کو جاتا ہے۔ اس کی مسافت کم ہے۔ اسی راستے سے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بعد ان کے پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے خاندان کے ساتھ مصر پہنچے تھے۔ دوسرا راستہ وہ ہے، جو بحر قلزم کی شاخ خلیج سویز کے کنارے کنارے جزیرہ نمائے سینا کے جنوب میں جاتا ہے۔ پھر صحرائے سینا پہنچ کر شمال کی طرف مڑ کر فلسطین پہنچتا ہے۔ یہ اول الذکر راستے کے مقابلے میں کافی طویل ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے ساتھ مصر سے نکلتے ہوئے اسی راستے کو اختیار کیا تھا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مختصر اور معروف راستے کو چھوڑ کر طویل اور زحمت طلب راستہ کیوں اختیار کیا، جب کہ اس کے درمیان دریا بھی پڑتا تھا؟ مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے: ''غالباً حضرت موسیٰ علیہ السلام صحرا کے صاف راستے سے سینا کی طرف جانا چاہتے ہوں گے۔ مگر ایک طرف مصر کی فوجی چھاؤنیوں سے بچنے کی کوشش اور دوسری طرف

فرعون کے تعاقب نے ان کو جبل ضفون کے قریب پہنچا دیا.....'' (تفہیم القرآن، ج ۲، ص ۷۶ کا مقابل صفحہ)

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے اس کی بہت اچھی توجیہ کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

''خدائے تعالیٰ کی مصلحت کا تقاضا یہی ہوا کہ وہ خشکی کی راہ چھوڑ کر دور کی راہ اختیار کریں اور قلزم کو پار کر کے جائیں.....واقعات رونما ہو جانے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ اس راہِ حق کو حق تعالیٰ نے اس لیے ترجیح دی کہ خشکی کی راہ سے گزرنے میں فرعون اور اس کی فوج سے جنگ ضرور ہو جاتی، کیوں کہ انھوں نے بنی اسرائیل کو قریب ہی آلیا تھا اور اگر دریا کا معجزہ پیش نہ آتا تو فرعون بنی اسرائیل کو واپس مصر لے جانے میں کام یاب ہو جاتا اور چوں کہ صدیوں کی غلامی نے بنی اسرائیل کو بزدل اور پست ہمت بنا دیا تھا، اس لیے وہ خوف اور رعب کی وجہ سے کسی طرح فرعون کے ساتھ جنگ پر آمادہ نہ ہوتے۔'' (قصص القرآن، ج ۱، ص ۴۲۳)

وہ کون سا دریا ہے، جس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے ساتھ عبور کیا تھا اور فرعون اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ اس میں غرق ہو گیا تھا، بائبل میں اس کا نام بحرِ قلزم مذکور ہے۔ اسے بحرِ احمر بھی کہتے ہیں۔ انگریزی میں وہ RED SEA کہلاتا ہے۔ اس کا جغرافیہ سمجھنے کی ضرورت ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے لکھا ہے: ''دراصل یہ بحرِ عرب کی ایک شاخ ہے، جس کے مشرق میں سرزمین عرب واقع ہے اور مغرب میں مصر۔ شمال میں اس کی دو شاخیں ہو گئی ہیں۔ ایک شاخ (خلیج عقبہ) جزیرہ نمائے سینا کے مشرق اور دوسری (خلیج سویز) اس کے مغرب میں واقع ہے۔ دوسری شاخ پہلی شاخ سے بڑی ہے اور شمال میں دور تک چلی گئی ہے۔ بنی اسرائیل اسی کے درمیان سے گزرے ہیں۔ اس شاخ کے شمالی دہانے کے سامنے ایک اور سمندر واقع ہے، جس کا نام بحرِ روم ہے اور بحرِ احمر اور بحرِ روم کے اس شمالی دہانے کے درمیان تھوڑا سا خشکی کا حصہ ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جہاں سے مصر سے فلسطین اور کنعان جانے والے کو بحرِ احمر عبور نہیں کرنا پڑتا تھا اور اس زمانے میں یہ راہ قریب ہی کی راہ سمجھی جاتی تھی اور بنی اسرائیل نے بہ حکمِ الٰہی یہ راہ اختیار نہیں کی تھی۔ اب اسی خشک زمین کو کھود کر بحرِ احمر (Red Sea) کو بحرِ روم سے ملا دیا گیا ہے اور اس ٹکڑے کا نام نہر سویز ہے۔'' (قصص القرآن، ج ۱، ص ۴۳۵-۴۳۶)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کس مقام سے دریا کو عبور کیا تھا، اس سلسلے میں مشہور مصری

محقق عبدالوہاب نجّار نے لکھا ہے: ''غرق فرعون اور عبور بنی اسرائیل کی جگہ متعین طور پر معلوم نہیں ہے۔ تورات میں بعض مقامات کے نام مذکور ہیں جن سے گزرتے ہوئے بنی اسرائیل مقام عبور تک پہنچے تھے، لیکن یہ مقامات آج معروف نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ خلیج سویز اس زمانے میں بحیرۂ مرہ تک وسیع تھی، یا اس کے بہت قریب تک تھی۔ اسی خلیج کو اس جانب سے بنی اسرائیل نے پار کیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ بنی اسرائیل نے خلیج سویز کو شمال میں اس جگہ سے جو 'عیون موسیٰ' کہلاتی ہے، پار کیا تھا۔'' (قصص الانبیاء، ص ۲۰۳)

عبدالوہاب نجار نے ایک اٹلس کا بھی حوالہ دیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے: ''میرے سامنے ایک تاریخی اٹلس ہے جسے الاستاذ محمد رفعت، مساعد مراقب تعلیم البنات فی وزارۃ المعارف مصر نے ۱۹۳۶ میں شائع کیا تھا۔ اس میں انھوں نے بنی اسرائیل کے دریا پار کرنے کا راستہ خلیج سویز اور بحیرۂ مرہ کے درمیان دکھایا ہے۔ انھوں نے دو خط کھینچے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیج سویز اس زمانے میں بحیرۂ مرہ سے ملی ہوئی تھی۔'' نجار کہتے ہیں کہ ''میرا خیال ہے کہ ان کی یہ بات صحیح ہے۔'' (قصص الانبیاء، ص: ۲۰۴)

مولانا مودودیؒ کی تحقیق بھی یہی ہے۔ انھوں نے تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۷۶ کے متوازی صفحے پر ایک نقشہ دیا ہے اور اس کے نیچے اس میں درج مقامات کی تشریح کی ہے۔ تشریح میں لکھا ہے:

''بحیراتِ مرّہ: تلخ پانی کی وہ کھاڑیاں، جو آج خلیج سویز سے فاصلے پر واقع ہیں، مگر قدیم زمانے میں سمندر کا پانی ان سے جا ملتا تھا۔ غالباً بنی اسرائیل نے بحیرات مرّہ کو کسی مقام سے عبور کیا اور یہیں فرعون غرق ہوا۔''

ابھی چند سال قبل ڈاکٹر شوقی ابوخلیل کا تیار کردہ مقامات قرآنی کا اٹلس دنیا کی مختلف زبانوں میں شائع ہوا ہے۔ اس کا عربی ایڈیشن میرے پیشِ نظر ہے۔ انھوں نے نقشے میں بحیرات مرہ سے بنی اسرائیل کا پار ہونا دکھایا ہے۔ البتہ تشریح میں لکھا ہے: ''بنی اسرائیل نے خلیج سویز کے شمالی حصے کو (عیون موسیٰ کے مقام سے) یا بحیرات مرہ کو پار کیا تھا اور وہیں منفتاح (فرعون) غرق ہوا تھا۔'' (اطلس القرآن، ص: ۸۱)

بائبل میں فرعون کے غرق ہونے اور بنی اسرائیل کے پار کرنے کا مقام 'بحر قلزم' مذکور ہے۔ اسی کی متابعت میں بعض سوانح نگاروں نے بھی یہی لکھ دیا ہے۔ یہ غلط بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ خلیج سویز بحر قلزم ہی کی شاخ ہے۔ البتہ چوں کہ اس سے قارئین کو غلط فہمی ہونے کا امکان ہے، اس لیے واضح طور پر 'خلیج سویز' لکھنا چاہیے۔ یا بحرِ قلزم لکھ کر قوسین میں خلیج سویز کا اضافہ کر دینا چاہیے۔

بہت سے لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ فرعون دریائے نیل میں غرق ہوا تھا۔ یہ تو قطعی غلط ہے۔

(۳) مدین بحرِ قلزم کی شاخ 'خلیج عقبہ' کے اطراف میں، حجاز کے شمال اور فلسطین کے جنوب میں، شام سے متصل واقع ہے۔ (قصص الانبیاء، ص ۱۶۵، اطلس القرآن، ص ۷۱)

یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے سفر مدین کے لیے اس برّی راستے کو اختیار کیا ہوگا جو فلسطین کو مصر سے ملاتا ہے۔ یعنی وہ مصر سے نکل کر پہلے سینا کے مشرقی حصے تک پہنچے ہوں گے اور وہاں سے سینا کے جنوب کی راہ اختیار کر کے مدین پہنچے گئے ہوں گے۔ لیکن مدین میں دس سال قیام کرنے کے بعد جب وہ مصر واپس ہوئے تو یہ بات قطعی ہے کہ انھوں نے جنوبی سینا کا راستہ اختیار کیا۔ اس لیے کہ اسی سفر میں طور پر، جو جزیرہ نمائے سینا کے جنوب میں واقع ہے، اللہ تعالیٰ نے انھیں شرفِ ہم کلامی بخشا اور منصبِ نبوت سے سرفراز کیا تھا۔ بہ الفاظ دیگر حضرت موسیٰؑ کے مصر سے مدین جانے کا راستہ مختصر تھا اور مدین سے مصر واپس آنے کا راستہ طویل۔

بہ ہر حال مصر سے مدین جانے کا جو بھی راستہ اختیار کیا جائے، اس کی مسافت مصر سے صحرائے سینا تک پہنچنے کی مسافت سے زیادہ ہوگی۔ پھر اگر بائبل کے بیان کے مطابق بنی اسرائیل کو بیابانِ سینا تک پہنچنے میں تین ماہ لگے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین کی مسافت کو آٹھ دنوں میں کیسے طے کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ مفسرین اور سوانح نگاروں نے لکھا ہے؟ یہ سوال قابلِ غور ہے۔ لیکن اس سلسلے میں چند باتوں کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

بائبل کے بیان کے مطابق بنی اسرائیل کی تعداد علاوہ بچوں اور چوپایوں کے چھ لاکھ تھی۔ اتنا بڑا قافلہ کتنی سست رفتاری سے سفر کرے گا اس کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے، جب کہ فرعون کی غرقابی کے بعد تعاقب کا اندیشہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ دوسری طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام

تنہا سفر کر رہے تھے، انھیں اپنے گرفتار ہونے کا بھی اندیشہ رہا ہوگا، اس لیے بغیر کسی توقف کے انھوں نے مسلسل اپنا سفر جاری رکھا ہوگا۔ پھر بھی مدین پہنچنے کی مدت آٹھ دن کم معلوم ہوتی ہے۔

اطلس القرآن میں ان مقامات کی تفہیم کے لیے جو نقشہ دیا گیا ہے، اسے درج کیا جا رہا ہے۔ اس سے امید ہے، ان مباحث کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

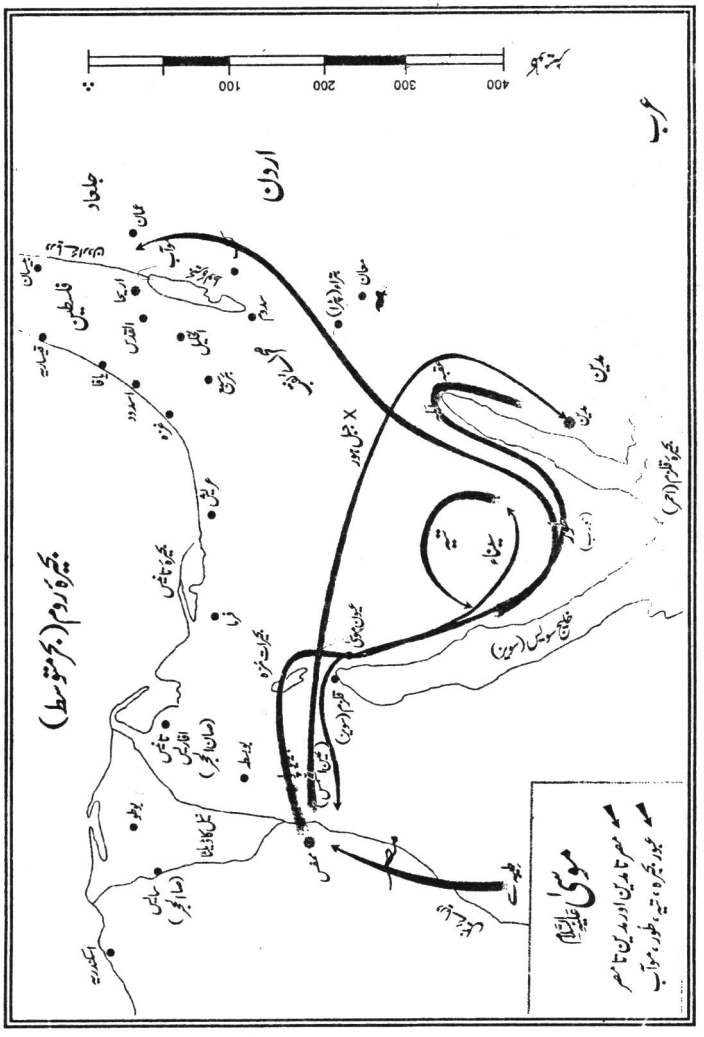

کتابیات

[اس مجموعہ میں جن ماٰخذ ومراجع سے استفادہ کیا گیا ہے ان میں سے چند اہم کتب کی تفصیلات ذیل میں دی جا رہی ہیں۔ البتہ حدیث کی، جن کتابوں کے حوالے کتب وابواب کی صراحت کے ساتھ دیے گئے ہیں، ان کے مطابع نہیں ذکر کیے گئے ہیں]

۱- قرآن مجید

کتب تفسیر

۲- طبری، ابو جعفر محمد بن جریر، جامع البیان عن تاویل آی القرآن (تفسیر طبری) دار المعارف مصر، ۱۹۶۹

۳- ابن کثیر، ابو الفداء عماد الدین اسماعیل، تفسیر القرآن العظیم (تفسیر ابن کثیر) دار الاشاعت دیوبند، ۲۰۰۲

۴- رازی، فخر الدین عمر، مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر /تفسیر رازی) المطبعة العامرة الشرفیة مصر، ۱۳۰۸ھ

۵- قرطبی، ابو عبد اللّٰہ محمد بن احمد الانصاری، الجامع لاحکام القرآن (تفسیر القرطبی) الهیئة المصریة العامة، ۱۹۸۷

۶- آلوسی، شهاب الدین السید محمود البغدادی، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، ادارة الطباعة المنیریة مصر

۷- مودودی، سید ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی

۸- اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، ۱۹۷۶

۹- عثمانی، شبیر احمد۔ تفسیر

حدیث وشروح حدیث

۱۰- بخاری، ابو عبد اللّٰه محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح المسند من احادیث رسول الله ﷺ (صحیح بخاری)

۱۱- مسلم بن حجاج القشیری النیسابوری، الصحیح (صحیح مسلم)

۱۲- ابو داؤد، سلیمان بن اشعث السجستانی، السنن (سنن ابی داؤد)

۱۳- ترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ، الجامع (جامع ترمذی)

۱۴- نسائی، ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب بن علی، السنن (سنن نسائی)

۱۵- ابن ماجه، ابو عبد اللّٰه محمد بن یزید بن عبد اللّٰه القزوینی، السنن (سنن ابن ماجه)

۱۶- مالك بن انس الاصبحی، الموطّا (موطا امام مالك)

۱۷- احمد بن حنبل الشیبانی، المسند (مسند احمد) المطبعة المیمنیة مصر، ۱۳۱۳ھ

۱۸- ابن الاثیر الجزری، مجد الدین ابو السعادات المبارك بن محمد، جامع الاصول فی احادیث الرسول، رئاسة ادارات البحوث العلمیة والافتاء والدعوة والارشاد الریاض، ۱۹۷۰

۱۹- خطیب تبریزی، ولی الدین محمد بن عبد اللّٰه، مشکوٰة المصابیح، تحقیق محمد ناصر الدین الالبانی، المکتب الاسلامی بیروت، ۱۹۸۵

۲۰- ابن حجر عسقلانی، الحافظ احمد بن علی، فتح الباری بشرح صحیح البخاری، دار المعرفة بیروت

۲۱- نووی، ابو زکریا محی الدین یحییٰ بن شرف، شرح صحیح مسلم، دار الریان للتراث قاهرة، مصر، ۱۹۸۷

۲۲- نووی، ابو زکریا محی الدین یحییٰ بن شرف، ریاض الصالحین من کلام سید المرسلین، مؤسسة الرسالة بیروت، ۱۹۸۰

کتب فقہ وفتاویٰ

۲۳- ابن قدامة، ابو محمد عبد اللّٰه بن احمد بن محمد المقدسی، المغنی علی مختصر الخرقی، القاهرة مصر ۱٤۱۳هـ/۱۹۹۲

۲۴- ابن تیمیة، تقی الدین احمد بن عبد الحلیم بن عبد السلام، الحرانی الدمشقی، مجموع الفتاوی، جمع و ترتیب: عبد الرحمن بن محمد بن قاسم، طبع سعودی عرب، ۱۳۹۸هـ

۲۵- نووی، ابو زکریا محی الدین یحي بن شرف، المجموع شرح المهذب، مکتبة الارشاد جدة

۲۶- عبد الرحمن الجزیری، الفقه علی المذاهب الأربعة، طبع مصر

۲۷- السید سابق، فقه السنة، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۹۸۳

۲۸- الموسوعة الفقهیة، وزارة الأوقاف والشئون الاسلامیة، کویت

۲۹- عثمانی، مفتی عزیز الرحمٰن، فتاویٰ دار العلوم دیوبند، شائع کردہ دار العلوم دیوبند

۳۰- مودودی، سید ابوالاعلیٰ، رسائل ومسائل، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی۔۲۰۰۵ء

دیگر

۳۱- ابن قیم، شمس الدین ابو عبد اللّٰه محمد بن ابی بکر الحنبلی الدمشقی،

زاد المعاد فی هدی خیر العباد، تحقیق: شعیب الارناؤوط، عبد القادر الارناؤوط، مؤسسة الرسالة بیروت، ۱۹۸۷

۳۲- عمر الاسکندری، تاریخ مصر الی الفتح العثمانی، مطبعة المعارف مصر، ۱۹۲۱

۳۳- عبد الوهاب النجار، قصص الأنبیاء، المکتبة التجاریة الکبریٰ، مصر، ۱۹۵۳

۳۴- د، شوقی ابو خلیل، أطلس القرآن، دار الفکر دمشق، ۲۰۰۰

۳۵- سیوہاروی، حفظ الرحمٰن، قصص القرآن، ندوۃ المصنفین دہلی، ۱۹۵۰

۳۶- عمری، سید جلال الدین۔ صحت ومرض اور اسلامی تعلیمات، ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

۳۷- اصلاحی، سلطان احمد، کم سنی کی شادی اور اسلام، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی

۳۸- ندوی، محمد رضی الاسلام، قرآن، اہل کتاب اور مسلمان، ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

۳۹- " " ، حقائق اسلام۔ بعض اعتراضات کا جائزہ، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی

۴۰- " " ، اسلامی پردہ۔ کیا اور کیوں؟ اسلامک بک فاونڈیشن نئی دہلی